فہرست مضمون نگارانِ معارف

جلد ۱۲۲

ماہ جولائی ۱۹۷۸ء تا دسمبر ۱۹۷۸ء

فہرست مضامین معارف

(جلد ۱۲۳)

ماہ جولائی ۱۹۷۸ء تا ماہ دسمبر ۱۹۷۸ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

جلد ۱۲۳ ماہ رجب المرجب ۱۳۹۸ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۷۸ء عدد ۱

مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرات

عرصہ ہوا ایک مجلس میں بہت سے لوگ جمع تھے، سیاسی مسائل زیر بحث تھے، اور اقوامِ عالم کی طاقت و صلاحیت کا جائزہ لیا جا رہا تھا، اس موقع پر ایک نوجوان مسلمان نے کہا کہ ہم دنیا میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں، دنیا کے گوشے گوشے میں مسلمان پھیلے ہوئے ہیں، اس وقت ان کی تعداد ستر کروڑ سے بھی متجاوز ہے، لاکھوں میل کا رقبہ تو ایسا ہی جہاں ہم ہی ہم ہیں، اس مجلس میں ایک جہاں دیدہ اور زمانہ کے سرد و گرم چشیدہ بزرگ بھی موجود تھے، انھوں نے اس نوجوان کو مخاطب کرکے کہا محض تعداد کی زیادتی سے کیا ہوتا ہے، ؟ سیکڑوں جانوروں کے گلہ کو ایک بچہ ہنکا کر جدھر چاہتا ہے، لے جاتا ہے، اصل تو صلاحیت و لیاقت ہے، جب یہ نہیں تو کروڑوں کی تعداد بھی بیکار ہے، یہ کہکر ان بزرگ نے آہ سرد بھری اور کہا کہ تم کہتے ہو کہ مسلمان ستر کروڑ ہیں لیکن میں کہتا ہوں، اے کاش ستر ہزار ہی ہوتے مگر ہوتے مسلمان -

---

اس بات کو سنے ہوئے بہت دن ہوگئے، اب وہ بزرگ دنیا میں موجود نہیں ہیں لیکن اُن کے الفاظ آج بھی کانوں میں گونج رہے ہیں، تاریخ کے اوراق اُن کے بیان کی تصدیق کرتے ہیں قرونِ اول کے مسلمانوں نے تعداد کی قلت سامان کی کمی، اور مشکلات و موانع کے باوجود عزم و حوصلہ اور ہمت و جانبازی کے ایسے کارنامے انجام دیئے ہیں جن پر آج تک دنیا محوِ حیرت ہے، اُن کی شجاعت و عزیمت کا یہ حال تھا کہ جب مدینۂ منورہ میں پہلی مردم شماری ہوئی، اور مسلمانوں کی تعداد پندرہ سو ۱۵۰۰

نکلی تو انھوں نے ایک پُرزور نعرہ لگایا، اور کہا کہ خدا کا شکر ہے کہ ہم ڈیڑھ ہزار ہوگئے ہیں، اب ہمیں دنیا میں کون دبا سکتا ہے یہ محض خالی الفاظ نہ تھے، بلکہ اُن کے پیچھے ایمان و یقین اور عزم و ہمت کا زور تھا، انھوں نے زبان سے جو کچھ کہا تھا، اسے سچ کر دکھایا، اور چند ہی برس میں ایشیا، افریقہ اور یورپ میں اُن کی فتح و کامرانی کے پھریرے اُڑنے لگے، دنیا کی عظیم الشان حکومتیں، دل بادل فوجوں کے ساتھ اُن کی راہ روکنے کے لئے بڑھیں، مگر سارا لاؤ لشکر اس سیلِ رواں کے سامنے تنکے کی طرح بہہ گیا، اور عرب کے شتربانوں نے ایرانی و رومی شہنشاہی کے پرخچے اُڑا دیئے،

یہ انقلاب اس تیزی کے ساتھ ہوا، اور دنیا کے اتنے طویل اور عریض خطہ میں ہوا کہ مورخین آج تک اس کی توجیہ سے عاجز ہیں، اگر تاریخ کی مستند اور ناقابلِ انکار شہادت موجود نہ ہوتی تو یہ واقعات افسانے معلوم ہوتے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ عرب کے تہی مایہ اور بے برگ و بار بدوؤں نے چند برسوں میں سارے عالم کو زیر و زبر کر ڈالا، اور جہاں بانی و جہاں آرائی، تہذیب و تمدن، علم و فن، اور اخلاق و شائستگی کا ایسا روشن نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا کہ صدیوں کے بعد بھی اس کی آب و تاب میں کمی نہیں آئی،

یہ سب تعداد کی قلت کی حالت میں ہوا، لیکن ان کا کردار بلند، سیرت پاکیزہ، اور دل نورِ ایمان سے منور تھے، لیکن آج اُن کے نام لیوا کروڑوں کی تعداد میں ہیں، مگر خس و خاشاک سے زیادہ ان کی وقعت نہیں ہے، اُن کے پاس حکومتیں بھی ہیں، دولت بھی ہے، ساز و سامان بھی ہے، مگر دل بے نور، دماغ کند، اور دست و بازو شل ہیں، اُن کے اندر نہ جوشِ عمل ہے نہ ولولۂ کار، نہ عزیمتِ صادقہ ہے، نہ ہمتِ مردانہ، عیش پسندی، اور عافیت کوشی ان کا شیوہ ہے، ان کے اندر نہ کسی اقدام کی ہمت ہے، نہ

کسی حریف سے ٹکر لینے کا حوصلہ، وہ محض نعروں سے دشمنوں کا قلع قمع کرنا چاہتے ہیں، پہلی جنگ عظیم کے موقع پر لکھنؤ کے ظریف اخبار اودھ پنچ نے جرمن فوجوں کو مخاطب کرکے ایک طنز آمیز نظم شائع کی تھی، جس کا ایک مصرع یاد ہے، ع :- جرمن تری توپوں میں ہم بانس چلادیں گے،

……٭……

اس ظریف اخبار نے کم از کم بانس چلانے کا تو حوصلہ کیا تھا، مگر آج مسلمان حکومتوں میں اتنی ہمت بھی نہیں ہے، عرب جن کے مٹھی بھر بزرگوں نے ایران وروم کی سطوت وجبروت کو خاک میں ملادیا تھا، ان کے نام لیوا آج اسرائیل جیسی چھوٹی حکومت کے ہاتھوں مسلسل زک پر زک اٹھا رہے ہیں، اور کچھ بنائے نہیں بنتی، ساٹھ برس پہلے جب لارڈ بالفور نے فلسطین میں یہودی حکومت کے قیام کا اعلان کیا تھا تو عرب چلا چلا کر کہہ رہے تھے، دیکھتے ہیں کہ اسرائیلی حکومت کس طرح قائم رہتی ہے، انگریزوں کے ہٹتے ہی دم کے دم میں ہم اسے نیست ونابود کردیں گے، اسرائیلی حکومت عربوں کے درمیان اس طرح گھری تھی کہ عرب متحد ہوتے تو کب کی فنا ہو چکی ہوتی لیکن انھیں اسرائیل سے زیادہ اپنے بھائیوں کو زیر کرنے کی فکر تھی نتیجہ یہ ہوا کہ ہر معرکہ میں عربوں کو شکست ہوئی، اور اپنا علاقہ دشمن کے حوالہ کرنا پڑا، لیکن اس دلخراش تجربہ کے بعد آج بھی اتحاد باہمی مفقود ہے، اور رزم ہو یا بزم ہر جگہ اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ ہے،

……٭……

میری صحت ابھی تک قابل اطمینان نہیں ہے، بخار جاتا رہا، مگر جگر اور طحال کا ورم ہنوز باقی ہے، علاج جاری ہے، اور ڈاکٹر جلد بحالی صحت کے متوقع ہیں، خدا کرے میں جلد اس قابل ہو جاؤں کہ مستعدی کے ساتھ دار المصنفین کی خدمات انجام دے سکوں،

……٭……

مقالات

یہود اور قرآن مجید

از

ضیاء الدین اصلاحی

(۲)

خزی قرآن مجید نے یہود کی سزاؤں میں اس کو بھی بیان کیا ہے، چنانچہ ایک جگہ اُن کے اس طرز عمل کا ذکر ہے کہ وہ کتاب الٰہی کی ان باتوں کو مانتے ہیں، جو اُن کی خواہشات کے مطابق ہوتی ہیں، لیکن ان باتوں کو ٹھکرا دیتے ہیں، جو ان کی مرضی اور خواہشات کے خلاف ہوتی ہیں، ایسی ناروا حرکت کرنے والوں کا انجام یہ ہوگا،

فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ	جو لوگ تم میں سے ایسا کرتے ہیں اُن
الا خزی فی الحیوۃ الدنیا و	کی سزا دنیا کی زندگی میں رسوائی
یوم القیامۃ یردون الی اشد	کے سوا اور کچھ نہیں، اور آخرت میں
العذاب ٥	یہ شدید ترین عذاب کی طرف لوٹائے
(بقرہ - ۸۵)	جائیں گے،

سورہ مائدہ میں خدا کی آیتوں میں اُن کی تحریف اور اُن کے احکام میں قطع و برید

کا انجام بتایا ہے:-

اولئک الذین لم یرد اللہ ان یطھر قلوبھم، لھم فی الدنیا خزی ولھم فی الآخرۃ عذاب عظیم،

یہی لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے پاک کرنا نہیں چاہا، ان کے لئے دنیا میں بھی رسوائی ہے، اور آخرت میں بھی ان کے لئے بڑا عذاب ہے،

(مائدہ: ۴۱)

یہود ونصاریٰ نے اپنی گروہ بندی اور باہمی عناد کی بنا پر ایک دوسرے کے معابد کو مسمار کیا، بیت المقدس میں ایک نے دوسرے کو ذکر وعبادت سے روکا، اس سلسلہ میں ان کے درمیان خونریز جنگیں ہوئیں، ان کی ان حرکتوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا:-

لھم فی الدنیا خزی ولھم فی الآخرۃ عذاب عظیم ہ

ان کے لئے دنیا میں رسوائی اور آخرت میں عذاب عظیم ہے،

(بقرہ: ۱۱۴)

ابھی تک یہود کی ذلت پستی، اور رسوائی کا مجمل ذکر ہوا ہے، قرآن نے اس کی چند صورتیں بھی بیان کی ہیں، یہاں ان کی مختصر تفصیل اس لئے پیش کی جاتی ہے کہ اوپر ان کی مغضوبیت، ملعونیت، اور ذلت ورسوائی کا جو ذکر ہوا ہے، ان سب کی حقیقت اچھی طرح طرح واضح ہو جائے،

وادی تیہ میں سرگردانی

بنی اسرائیل اکثر خانہ بدوشی اور جلاوطنی کی مصیبت میں مبتلا رہے، اور کبھی ایک جگہ ان کو تمکن سے رہنا نصیب ہوا، حضرت ابراہیمؑ کا وطن بابل (عراق) تھا، مگر انھوں نے اپنے بیٹے حضرت اسحٰق کو فلسطین میں بسایا، ان کے فرزند حضرت یعقوبؑ (اسرائیل) کے

بیٹوں نے رشک وحسد میں اپنے چھوٹے بھائی حضرت یوسفؑ کو ایک کنوئیں میں ڈال دیا، لیکن قدرت الٰہی نے انھیں مصر کے تخت حکومت تک پہنچا دیا، اور اس طرح ان کے والد ماجد اور دوسرے اعزہ مصر پہنچ گئے، یہاں عرصہ تک وہ عزت وراحت کے ساتھ رہے لیکن حضرت یوسفؑ کے بعد آہستہ آہستہ اُن کے اندر اخلاقی خرابیاں پیدا ہو گئیں، نتیجہ یہ ہوا کہ فراعنہ کے ہاتھوں بنی اسرائیل ذلت وخواری میں مبتلا ہوئے، بالآخر خدا نے حضرت موسیٰؑ کے ذریعہ انھیں فرعون کے مظالم سے چھٹکارا دلایا، اس کی سزا یہ دی گئی کہ وہ چالیس سال تک خانہ بدوشوں کی طرح حیران وسرگرداں پھرتے رہے،

قال فانھا محرمۃ علیھم اربعین سنۃ یتیھون فی الارض فلا تأس علی القوم الفاسقین،

خداوند نے فرمایا تو یہ سرزمین ان پر چالیس سال کے لئے حرام ٹھہری یہ لوگ زمین میں بھٹکتے پھریں گے، سو تو اے موسیٰ ان نافرمان لوگوں کا غم نہ کھا،

(مائدہ-۲۶)

اس کے بعد وہ جس ذلت وخواری کے ساتھ ادھر ادھر منتشر پھرتے رہے اس کی طرف اس مضمون میں پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے، آگے ان کے خوف ودہشت، قید وبند، جلاوطنی وبربادی کے بعض واقعات بیان کئے جائیں گے،

بنی اسرائیل کی ذلت وانتشار کا ایک واقعہ

حضرت سموئیل علیہ السلام کے زمانہ میں بنی اسرائیل سخت انتشار میں مبتلا تھے، ان کی مذہبی واخلاقی حالت بہت خراب تھی، ہر طرف سے دشمنوں کی ان پر یورش تھی، فلسطینی ان کا قتل عام کر رہے تھے، اور اُن کے خوف سے بنی اسرائیل نے عقرون سے لے کر جات تک کے سارے شہر خالی کر دئے تھے، قرآن مجید کی مندجہ ذیل

آیت میں اسی کی طرف یوں اشارہ ہے،

الم تر الی الذین خرجوا من	کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا
دیارھم وھم الوف حذر	جو ہزاروں کی تعداد میں ہونے کے
الموت،	باوجود موت کے ڈر سے اپنے گھروں
(بقرہ: ۲۴۳)	سے بھاگ کھڑے ہوئے،

بنی اسرائیل اس بیچارگی اور ذلت سے اس قدر تنگ اور پریشان تھے کہ حضرت سموئیلؑ سے انھوں نے درخواست کی، کہ ایک امیر مقرر کر دیں تاکہ اس کی سربراہی میں وہ دشمنوں کا مقابلہ کر کے ان کے قبضہ سے اپنے شہروں کو نکال سکیں، حضرت سموئیلؑ کو ان کے مزاج سے واقفیت اور ان کی بزدلی اور پست ہمتی کا تجربہ تھا، اس لئے انھوں نے کہا کہیں تم میدانِ جنگ سے فرار نہ اختیار کر لو، اس پر انھوں نے جواب دیا، بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے، جب کہ ہماری یہ درگت ہو چکی ہے کہ

وما لنا الا نقاتل فی	بھلا ہم خدا کی راہ میں جہاد کیوں
سبیل اللہ وقد اخرجنا	نہ کریں گے جب کہ ہم اپنے گھروں
من دیارنا وابنائنا،	سے نکال دیئے گئے ہیں، اور اپنے
(بقرہ: ۲۴۶)	بچوں سے جدا کر دیئے گئے ہیں،

مگر ہوا وہی جس کا حضرت سموئیلؑ نے اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ عین وقت پر بنی اسرائیل نہایت بزدلی سے یہ کہکر میدانِ جنگ سے بھاگ کھڑے ہوئے کہ

لا طاقۃ لنا الیوم بجالوت	اب ہم میں جالوت اور اس کی فوجوں
وجنودہ، (بقرہ: ۲۴۹)	سے لڑنے کی سکت نہیں،

مقدس تابوت کا چھن جانا

بنی اسرائیل کی اس سے بڑھ کر اور کیا ذلت و رسوائی ہو سکتی ہے کہ ان کے مذہبی آثار و تبرکات تک اُن کے دشمن اُن سے چھین لے گئے، تورات میں مقدس تابوت کے چھینے جانے کا واقعہ یوں بیان ہوا ہے،

"اور فلسطی لڑے اور بنی اسرائیل نے شکست کھائی اور ہر ایک اپنے ڈیرے کو بھاگا، اور وہاں نہایت بڑی خونریزی ہوئی، کیونکہ تیس ہزار اسرائیلی پیادے وہاں کھیت آئے، اور خدا کا صندوق چھن گیا، (سموئیل باب ۴ آیات ۱۰ و ۱۱)

اس صندوق (تابوت) کو ان کے قبلہ کی حیثیت حاصل تھی، وہ اس کو اپنے خیمۂ عبادت میں ایک خاص جگہ پر نہایت اہتمام کے ساتھ پردوں کے بیچ میں رکھتے اور دعا و عبادت کے وقت اسی کی طرف متوجہ رہتے، ان کے ربی و کاہن غیبی رہنمائی کے لئے بھی اسی کو مرجع بناتے، مشکل حالات، قومی مصائب اور جنگ کے میدانوں میں بنی اسرائیل کے حوصلے قائم رکھنے میں یہ صندوق ایک بڑا عامل تھا، حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں تو اس میں تورات اور صحرا کی زندگی کے دور کی بعض یادگاریں محفوظ کی گئی تھیں، لیکن پھر اس میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ اور ان کے خاندان کے بعض تبرکات بھی محفوظ کر دیئے گئے تھے،

ایسے مقدس اور اہم تابوت کا چھن جانا اُن کے لئے کس قدر ذلت و رسوائی، اور رنج و غم کا باعث تھا، اس کا اندازہ تورات کے اس بیان سے ہوگا:۔

"اور خدا کا صندوق چھن گیا، جب اس نے خدا کے صندوق کا ذکر کیا، تو وہ کرسی پر سے پچھاڑ کھا کر پھاٹک کے کنارے گرا، اور اس کی گردن ٹوٹ گئی، ......

اور کہنے لگے کہ حشمت اسرائیل سے جاتی رہی، اس لئے کہ خدا کا صندوق چھن گیا تھا، اور اس کا خسر اور خاوند جاتے رہے تھے، سو اس نے کہا کہ حشمت اسرائیل سے

جاتی رہی، کیونکہ خدا کا صندوق چھن گیا ہے، (سموئیل باب ۴ آیات ۱۷ تا ۲۳)

اس سخت حادثہ کی وجہ سے تقریباً بیس سال تک بنی اسرائیل پر یاس اور مردنی کی کیفیت چھائی ہوئی تھی، تورات ہی کا بیان ہے،

"اور جس دن سے صندوق قریۂ یعریم میں رہا، تب سے ایک مدت ہوگئی یعنی بیس برس گذرے، اور اسرائیل کا سارا گھرانہ خداوند کے پیچھے نوحہ کرتا رہا"

(سموئیل ۷ ، ۲:)

لیکن خدا نے اپنے فضل سے تابوت کی واپسی کا سامان کرکے بنی اسرائیل کو عزت و سربلندی عطا کی، قرآن مجید نے طالوت کے قصہ میں تابوت کی اہمیت اور اس کی بنی اسرائیل میں دوبارہ واپسی کا اس طرح ذکر کیا ہے:-

وقال لهم نبيهم ان آية ملكه ان يأتيكم التابوت فيه سكينة من ربكم وبقية مما ترك آل موسى وال فرعون تحمله الملائكة ان فى ذلك لآية لكم ان كنتم مؤمنين، (بقرہ: ۲۴۸)

اور ان کے نبی (سموئیل) نے ان سے کہا کہ اس (طالوت) کی امارت کی نشانی یہ ہے کہ تمہارے پاس وہ صندوق آجائے گا، جس میں تمہارے خداوند کی طرف سے سامان تسکین اور آل موسیٰ و آل ہارون کی چھوڑی ہوئی یادگاریں ہیں، صندوق کو فرشتے اٹھائے ہوں گے، بے شک اس میں تمہارے لئے نشانی ہے، اگر تم ایمان رکھتے ہو،

تورات کے ناقلین نے تابوت کی واپسی کے واقعہ کو گڈمڈ کردیا ہے، اس لئے اس کا بیان قرآن سے مختلف ہے،

بنی اسرائیل کی ایک نہایت عبرتناک سزا

بنی اسرائیل کا بھی عجیب معاملہ تھا، اگر ان کو خدا کی طرف سے کوئی موقع اور مہلت دی جاتی تو وہ اس کی مطلقاً قدر نہ کرتے، بلکہ انتہائی ڈھیٹ اور جری ہوکر مزید شرارتیں کرنے لگتے، جن کی انھیں سخت سزا بھگتنی پڑتی، یہ پہلے واضح کیا جاچکا ہے کہ سبت (سنیچر کا دن) اُن کے یہاں کتنا متبرک و مقدس تھا، مگر ان کی ایک جماعت کو اس کی حرمت و تقدس پامال اور برباد کرنے میں ذرا بھی تکلف نہ ہوا، ان نافرمانوں کو یہ سزا دی گئی،

فقلنا لهم كونوا قردة خاسئين، (بقرہ: ۶۵)

سو ہم نے ان سے کہا ذلیل وخوار بندر ہوجاؤ،

گو اس کے متعلق تورات خاموش ہے لیکن قرآن کے انداز بیان سے ظاہر ہوتا ہے، کہ یہ بنی اسرائیل کی تاریخ کا ایسا مشہور و متعارف واقعہ تھا جس کو عہد نبوت کے یہود بھی اچھی طرح جانتے تھے، چنانچہ فرمایا:-

ولقد علمتم الذين اعتدوا منكم فى السبت ۵ (بقرہ: ۶۵)

اور بلاشبہ تم نے ان لوگوں کو خوب جان لیا ہے، جنھوں نے سبت کے معاملہ میں حد سے تجاوز کیا،

اور دوسری جگہ ہے:-

وَسْئَلهُمْ عَنِ القرية التى كانت حاضرة البحر اذ

اور ان سے اس بستی کا حال پوچھو جو سمندر کے کنارے تھی جب کہ وہ سبت

یعدون فی السبت ۝ (اعراف: ۱۶۳)

کے معاملہ میں حد سے تجاوز کرتے تھے،

سورۂ مائدہ میں اس کی بھی تصریح ہے کہ

وَجَعَلَ مِنْھُمُ القردۃ و الخنازیر (مائدہ: ۶۰)

اور ان کے اندر سے اللہ نے بندر اور سور بنائے،

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہ واقعی بندر بنا دئے گئے تھے، اور ان کی جسمانی ہیئت تبدیل ہوگئی تھی، یا ان کی صورتیں تو مسخ نہیں کی گئی تھیں، اور نہ وہ بندروں اور سوروں کے جسم و قالب میں تبدیل ہوئے تھے، بلکہ اپنی سیرت و عادت اور مزاج و خصلت کے اعتبار سے بندروں اور سوروں جیسے ہوگئے تھے، ان میں سے جس تاویل کو بھی اختیار کیا جائے، نتیجہ کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں پڑتا، یہود نے اپنے کو جس طرح بے لگام اور بے قید بنا لیا تھا، اور جس طرح وہ اپنی خواہشات کے غلام ہوگئے تھے، اس کے بعد چاہے ان کے اور بندروں کے درمیان صوری فرق رہا بھی ہو، لیکن معنوی فرق تو بالکل ہی باقی نہیں رہ گیا تھا، اسی حیثیت سے ان کی تشبیہ گدھوں اور کتوں سے بھی دی گئی ہے،

مثل الذین حملوا التوراۃ ثم لم یحملوھا کمثل الحمار یحمل اسفارا ۝ (جمعہ: ۵)

ان لوگوں کی مثال جن کو تورات کا حامل بنایا گیا، مگر وہ اس کے واقعی حامل نہیں بن سکے، گدھے کی طرح ہے جو کتابوں کا پشتارہ اٹھائے ہو،

دوسری جگہ فرمایا:۔

ولکنہ اخلد الی الارض واتبع ھواہ فمثلہ کمثل الکلب ۝ (اعراف: ۱۷۶)

لیکن وہ زمین کی طرف مائل ہوا، اور اپنی خواہش کی پیروی کی، سو اس کی مثال کتے جیسی ہے،

دراصل یہ یہود کی لعنت و پھٹکار کی ایک نہایت جامع اور بلیغ تعبیر ہے،

مذہبی سختیاں اور بندشیں

یہود کو ان کی سرکشی اور شرارت کی یہ سزا بھی دی گئی کہ دین جو فی نفسہٖ آسان اور سہل تھا، ان کے لئے بہت دشوار اور مشکل کر دیا گیا تھا، قرآن مجید نے یہودی مذہب کی غیر معمولی شدت کو اصر و اغلال کہا ہے، اور بتایا ہے کہ نبی اکرمؐ ان کو ان بیجا سختیوں، احکام و عقائد کے ناقابلِ تحمل بوجھ اور دوسری بیڑیوں اور زنجیروں سے نجات دلانے کے لئے مبعوث کئے گئے ہیں،

ویضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم (اعراف: ۱۵۷)

اور ان پر سے وہ بوجھ اور پابندیاں اتارتا ہے جو ان پر تھیں،

یہود نے اپنی شرارت پسندی کی وجہ سے بعض مسائل کے بارہ میں اس قدر سوالات کئے کہ اُن کے لئے جواز کی راہیں تنگ ہوگئیں، مثلاً جب خدا نے اُن کو گائے ذبح کرنے کا حکم دیا تو انھوں نے اس کی نوعیت متعین کرانے کے لئے سوالات کا طومار باندھ دیا، جس کی وجہ سے ایک آسان حکم کی تعمیل بہت دشوار ہوگئی،

ان کی باغیانہ روش اور سرکشی نے بھی اُن کے لئے جائز کو ناجائز اور حلال کو حرام بنا دیا،

فبظلم من الذین ھادوا حرمنا علیھم طیبات احلت لھم (نساء: ۱۶۰)

پس ان لوگوں کے ظلم کی وجہ سے جنھوں نے یہودیت اختیار کی، ہم نے ان پر بعض پاکیزہ چیزیں حرام کر دیں جو ان کیلئے حلال تھیں

علمائے یہود نے تحریم و تحلیل کا قانون اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا، اس کے نتیجے میں خود انھوں نے بہت سی جائز چیزوں کو یہود کے لئے حرام قرار دیدیا تھا، ان کے اس طرح کے طبعزاد فتوے اور من گھڑت رائیں تورات کا جزو بن گئی تھیں، اور ان کو وہی درجہ حاصل ہوگیا تھا، جو خود کتاب اللہ کا ہے، قرآن نے جب ان کی ان خود ساختہ حرمتوں کو مسلمانوں کے لئے جائز اور حلال قرار دیا، تو وہ معترض ہوئے کہ مسلمان ملت ابراہیمی کی اتباع کے دعویٰ کے باوجود اس کے محرمات کو حرام نہیں سمجھتے، چنانچہ ان کے اسی طرح کے ایک فقہی اعتراض کو نقل کرکے یہ جواب دیا گیا ہے:-

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَائِيلُ عَلَىٰ نَفْسِهِ مِن قَبْلِ أَن تُنَزَّلَ التَّوْرَاةُ قُلْ فَأْتُوا بِالتَّوْرَاةِ فَاتْلُوهَا إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (آل عمران ۹۳)

ہر کھانا بنی اسرائیل کے لئے حلال تھا، بجز اس کے جو اسرائیل نے خود اپنے اوپر حرام کرلیا تھا، قبل اس کے کہ تورات اترے، تو تم کہدو کہ تورات لاؤ اور اسے پڑھو اگر تم سچے ہو،

واقعہ یہ ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے احتیاطاً یا طبعی کراہت وغیرہ کے سبب سے اونٹ کے گوشت کا استعمال ترک کردیا تھا، ان کی اقتدا میں ان کے بعض متبعین بھی اس کے استعمال سے پرہیز کرنے لگے، بعد میں یہودی فقہا نے حضرت یعقوبؑ کے ایک طبعی اور ذوقی عمل کو حکم الٰہی کا درجہ دیدیا ہے اور سرے سے اونٹ ہی کو حرام قرار دیدیا، حالانکہ نہ یہ خدا کا حکم تھا، اور نہ اس کو ملت براہیمی سے کوئی واسطہ تھا، یہود کی اس بغاوت اور سرکشی کا نتیجہ یہ نکلا کہ

وعلى الذين هادوا حرّمنا

اور ان لوگوں پر جو یہودی ہوئے ہم نے

علیهم کل ذی ظفر ومن البقر والغنم حرمنا علیهم شحومهما الا ما حملت ظهورها او الحوایا او ما اختلط بعظم ذلك جزینا هم ببغیهم وانا لصادقون (انعام: ۱۴۶)

سارے ناخن والے جانور حرام کئے، اور گائے اور بکری کی چربی بھی ان پر حرام کردی، بجز اس کے جو ان کی پیٹھ یا انتڑیوں سے پیوست ہو، یا کسی ہڈی سے لگی ہوئی ہو، یہ ہم نے ان کو ان کی سرکشی کی سزا دی ہے، اور ہم بالکل سچے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا، کہ اونٹ کی طرح بہت سے دوسرے جانور، پرند اور چربی بھی یہود کے لئے حرام قرار دیدی گئی تھی، تورات میں اس کی تفصیل یوں بیان ہوئی ہے،

"پھر خداوند نے موسیٰ اور ہارون کو خطاب کرکے فرمایا کہ تم بنی اسرائیل سے کہو سب چارپایوں میں سے جو زمین پر ہیں، تمھیں کھانا روا ہے، سو یہ ہیں سب چارپایے، کھروالے جن کا کھر چرا ہو، اور وہ جگالی کرتے ہوں، تم انھیں کھاؤ، مگر ان میں سے جو جگالی نہیں کرتے ہیں یا کھر ان کے چرے ہوئے نہیں ہوتے ہیں، اُن کو نہ کھاؤ، جیسے اونٹ وہ جگالی تو کرتا ہے پر کھر اس کا چرا ہوا نہیں ہوتا، سو وہ تمھارے لئے ناپاک ہے، اور سافن کہ وہ جگالی کرتا ہے لیکن کھر اس کا چرا ہوا نہیں تو وہ بھی تمھارے لئے ناپاک ہے اور خرگوش، کہ وہ تو جگالی کرتا ہے، پر اس کا کھر چرا ہوا نہیں ہے، وہ بھی تمھارے لئے ناپاک ہے، (احبار ۱۱-۱تا۷)

اس حکم کی شدت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ:-

"اور سب چارپایے جس کے کھر دو حصے میں ہوں، پر پاؤں چرے ہوئے نہ ہوں اور جگالی کرتے ہوں وہ تمھارے لئے ناپاک ہیں، جو کوئی ان کو چھوے گا وہ

ناپاک ہوگا، اور ہر ایک جو انگلیوں کے بل چلتے ہیں، اور پاؤں پر چلنے والے ہر طرح کے جانوروں میں سے تمھارے لئے ناپاک ہیں، جو کوئی ان میں سے کسی کی لاش کو چھوئے گا، وہ شام تک ناپاک رہے گا، اور جو کوئی ان میں سے کسی کی لاش کو اٹھائے گا، وہ کپڑے اپنے دھوئے اور شام تک ناپاک رہے گا، اور یہ سب تمھارے لئے ناپاک ہیں، (احبار ۱۱-۲۶ تا ۲۸)

چربی کے متعلق توراۃ کا حکم ملاحظہ ہو، :-

"اور خداوند نے موسیٰ سے کہا بنی اسرائیل سے کہہ تم لوگ نہ تو بیل کی، نہ بھیڑ کی اور نہ بکری کی کچھ چربی کھانا، جو جانور خود بخود مر گیا ہو، اور جس کو درندوں نے پھاڑا ہو، ان کی چربی اور کام میں لاؤ تو لاؤ، پر تم کسی حال میں نہ کھانا، کیونکہ جو کوئی ایسے چوپائے کی چربی کھائے، جسے لوگ آتشیں قربانی کے طور پر خداوند کے حضور چڑھاتے ہیں، وہ کھانے والا آدمی اپنے لوگوں میں سے کاٹ ڈالا جائیگا"

(احبار ۱۷ : ۲۲ - ۲۵)

سبت کے احکام سے بھی یہودی مذہب کی سخت گیری اور تشدد ظاہر ہوتا ہے، یہود کے یہاں یہ دن نہایت مقدس اور محترم تھا، توراۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اس دن سارا کاروبار بند کر دینے کی ہدایت کی گئی تھی، لونڈی غلاموں، یہاں تک کہ مویشی اور جانوروں سے بھی کام کاج لینے کی ممانعت تھی، یہود کے علما نے اپنے غلو و تشدد سے اس حکم کو اس قدر بڑھایا کہ اس دن مریضوں کے لئے صحت اور شفا کی دعا بھی نہیں کی جا سکتی تھی، اور جو لوگ اس دن کی حرمت اور تقدس کا خیال نہ کر کے اپنے کاروبار کو ترک نہیں کرتے تھے توراۃ کے باب خروج میں انکو ہلاک کرنے اور مار ڈالنے کا حکم تھا، دوسری جگہ ہے :-

اور جب بنی اسرائیل بیابان میں تھے، انھوں نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ سبت کے دن لکڑیاں جمع کرتا تھا، تب وہ اس کو جو لکڑیاں جمع کر رہا تھا، پکڑ کر موسیٰ اور ہارون اور ساری جماعت کے پاس لائے، انھوں نے اسے قید میں ڈالا کیونکہ ان کو نہیں کہا گیا تھا کہ اس سے کیا کیا جائے تب خداوند نے موسیٰ سے فرمایا کہ یہ شخص مار ڈالا جائے ساری جماعت خیمہ گاہ کے باہر اس پر پتھراؤ کرے، چنانچہ ساری جماعت اسے خیمہ گاہ کے باہر لے گئی اور اسے سنگسار کیا کہ وہ مر گیا جیسا خداوند نے موسیٰ کو فرمایا تھا" (گنتی ۱۵: ۳۲-۳۶)

لیکن احترام و تقدس صرف یہود کے لئے مخصوص تھا اور ان کو یہ سخت ترین حکم ان کی سرکشی اور شرارت کی وجہ سے دیا گیا تھا قرآن نے جب اس حقیقت کا اعلان کیا تو انھوں نے یہ پروپیگنڈہ شروع کیا، کہ مسلمان دین حنیف اور ملت ابراہیمی کے متبع ہونے کے باوجود سبت کی حرمت و تقدس کے قائل نہیں ہیں، قرآن نے ان کے اس مزعومہ کی تردید کی اور بتایا کہ اس حرمت کا ملت ابراہیمی سے کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ دراصل یہ تمھارے اختلاف اور عدم اطاعت کی تم کو سزا دی گئی ہے،

انّما جعل السّبت علی	سبت تو صرف ان لوگوں کے لئے
الّذین اختلفوا فیه و	بنایا گیا تھا، جنھوں نے اس کے بارہ
ان ربک لیحکم بینهم	میں اختلاف کیا تھا اور بیشک
یوم القیامة فیما کانوا	تیرا خداوند قیامت کے روز ان
فیه یختلفون ہ	کے درمیان ان چیزوں کا فیصلہ
(نحل: ۱۲۴)	کر دے گا جن میں یہ جھگڑتے ہیں،

غرض یہ مذہب سختی اور شدت کا مجموعہ بن گیا تھا، توراۃ کے باب احبار میں طہارت

اور عورتوں کے جو احکام بیان ہوئے ہیں، اُن سے اس مذہب کی سخت گیری پوری طرح واضح ہے،

یہود کی دو بڑی تباہیاں

یہود کو اپنی شرارتوں اور مفسدانہ حرکتوں کی بنا پر دو زبردست تباہیوں اور سخت ذلت و رسوائی سے دوچار ہونا پڑا تھا، یہودی تاریخ کے ان واقعات کی جانب قرآن نے ان آیتوں میں اشارہ کیا ہے،

وقضینا الیٰ بنی اسرائیل فی	اور ہم نے بنی اسرائیل کے بارہ میں
الکتاب لتفسدن فی الارض	کتاب میں طے کر دیا تھا کہ تم دو مرتبہ
مرتین ولتعلن علواً کبیرا،	زمین میں فساد برپا کروگے، اور
فاذا جاء وعد اولاھما بعثنا	بڑی سرکشی دکھاؤگے، سو جب ان
علیکم عباداً لنا اولی باسٍ	میں سے پہلی سرکشی کا موقع آیا تو
شدید فجاسوا خلال الدیار	ہم نے تم (بنی اسرائیل) پر اپنے سخت
وکان وعداً مفعولاً، ثم	زور آور بندوں کو مسلط کر دیا، پس
رددنا لکم الکرۃ علیھم و	انھوں نے گھروں میں گھس کر ان کو
امددناکم باموال وبنین	تاراج کیا، پھر ہم نے تم کو دوبارہ
وجعلناکم اکثر نفیرا ٥ ان	ان پر غلبے کا موقع دیا، اور مال
احسنتم احسنتم لانفسکم و	اولاد سے مدد کی، اور تمھاری تعداد
ان اسأتم فلھا فاذا جاء	بڑھا دی، تم نے اگر بھلائی کی، تو
وعد الآخرۃ لیسوء وا وجوھکم	اپنے ہی لئے، اور اگر برائی کی تو بھی
ولیدخلوا المسجد کما دخلوہ	اپنے لئے، پھر جب دوسرے وعدہ
اول مرۃ ولیتبروا	کا وقت آیا، تب بھی اپنے طاقتور

ما علوا تتبیرا ٥	بندے مسلط کیے تاکہ وہ تمھارے
(بنی اسرائیل ع-۱)	چہرے بگاڑ دیں، اور مسجد بیت المقدس
	میں پہلی مرتبہ کی طرح داخل ہو جائیں
	اور جس چیز پر ان کا بس چلے، اسے
	تباہ کر ڈالیں،

پہلی تباہی اور بخت نصر کا بیت المقدس کو تاراج کرنا

پہلی مرتبہ بابل و نینوا کے بادشاہ بخت نصر[1] نے ان کو زدوکوب کیا، اور یروشلم کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، اس زمانہ میں یہود سخت دینی و اخلاقی انحطاط میں مبتلا تھے، اور ان پر دنیا پرستی کا ایسا غلبہ تھا کہ کتاب الٰہی کو پس پشت ڈال کر اوہام و خرافات میں پڑ گئے تھے، سفلیات پر عقیدہ رکھتے تھے، اور جادوگری کو اپنا پیشہ اور مشغلہ بنا لیا تھا، علاوہ ازیں ان کے اندر شدید خانہ جنگی اور قبائلی عصبیت کی آگ بھی بھڑک اٹھی تھی، اسرائیل اور یہودیہ کی الگ الگ سلطنتیں قائم ہوگئی تھیں، اسرائیلی ریاست کے لوگوں میں ہمسایہ قوموں کے اثر سے مشرکانہ عقائد رچ بس گئے تھے، اسی زمانہ میں حضرت الیاسؑ مبعوث ہوئے، اور انھوں نے ان کو شرک و بت پرستی اور اخلاقی پستی سے باز آنے کی دعوت دی، لیکن سامریہ کا اسرائیلی بادشاہ اخی اب[2] اپنی

[1] بابل و نینوا کی سلطنتیں نہایت مستحکم اور متمدن تھیں، ۶۱۲ ق م میں نینوا کی تباہی کے بعد آشوری فرماں روائی ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی، اس کے بعد بابل کی شہنشاہی کی بنیادیں مزید مستحکم ہوگئیں، اور اس کی قوت و شوکت میں بڑا اضافہ ہوگیا، بخت نصر اسی ترقی یافتہ اور عظیم الشان حکومت کا فرمانروا تھا، اس کی فتوحات کا دائرہ بہت وسیع تھا، بیت المقدس پر اس کا حملہ تاریخ کا ایک عظیم الشان واقعہ ہے،

[2] اس نے صیدا (لبنان) کے بادشاہ کی لڑکی ایزبل

مشرک بیوی کے ایماء سے اُن کے پیچھے پڑ گیا، اس بنا پر ان کو ہجرت کرنی پڑی، غرض جب یہ لوگ کسی طرح باز نہ آئے تو آشوری فاتحین نے مسلسل حملے کئے، اسی زمانہ میں عاموس نبی نے بھی ان کو بار بار تنبیہ کی لیکن شاہ اسرائیل نے خدا کے اس برگزیدہ پیغمبر کو ملک بدر کر دیا، اس کے بعد ہی آشور کے سخت گیر فرمانروا ساگون نے سامریہ کو فتح کر کے اسرائیل کی حکومت کا خاتمہ کر دیا، اس میں ہزاروں اسرائیلی مارے گئے، اور ہزاروں تتر بتر ہو گئے، اور اُن کی جگہ غیر قومیں اسرائیلی علاقوں میں آباد ہو گئیں،

یہودیہ کی حکومت بھی حضرت سلیمانؑ کے بعد شرک اور اخلاقی برائیوں میں ملوّث ہو گئی تھی، اس کے ایک بادشاہ نے اخی اب کی بیٹی سے شادی کر لی، اس مشرک شہزادی نے یہودیہ میں شرک و بت پرستی کو مزید فروغ دیا، اور سامریہ کی اسرائیلی ریاست کی طرح اس پر بھی آشوریوں نے متعدد حملے کئے، اس کے شہروں کو تباہ کیا لیکن وہ اس کا خاتمہ نہ کر سکے، مگر جب حضرت یسعیاہؑ اور حضرت یرمیاہؑ کی مسلسل دعوت و تلقین کے باوجود بھی وہ شرک و بت پرستی اور اخلاقی پستی سے باز نہ آئے، تو چھٹی صدی قبل مسیح میں بخت نصر نے یروشلم سمیت پوری دولت یہودیہ کو اپنے زیر نگیں کر لیا، اور یہودیہ کے بادشاہ کو قید کر لیا، اس کے بعد بھی انھوں نے اپنے حالات کی اصلاح نہ کی، بلکہ بابل کے خلاف بغاوت اور شورش پر آمادہ ہوئے، ۵۸۶ ق م میں اس نے زبردست حملہ کر کے یروشلم کو تباہ اور مقدس ہیکل کو مسمار کر دیا، اس سخت تباہی میں بے شمار یہودی قتل کئے گئے، اور بے شمار قید کئے گئے، اور جو بچے وہ یا تو

(بقیہ حاشیہ ص ۱۹) سے شادی کر لی تھی، اور اس کے پھندے میں پڑ کر خود بھی مشرک ہو گیا تھا، اسی نے سامریہ میں بعل کا مندر اور مذبح تعمیر کیا تھا اور اسی کی کوششوں سے اسرائیل کے شہروں میں بعل کے نام پر علانیہ قربانی کی جاتی تھی،

منتشر ہو گئے، یا ہمسایہ قوموں کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہوئے،

ایک طویل عرصہ کی غلامی اور پسپائی کے بعد جب یہود کے اندر ایمان و عمل کے تقاضے پورا کرنے کا جذبہ پیدا ہوا، اور وہ توبہ و انابت اور اصلاح حال کے لئے آمادہ ہوئے، تو اللہ نے اُن پر اپنی رحمت نازل کی، اور بابل کی سلطنت کا خاتمہ ہوا، بنوکدنضر (بخت نصر) کے جانشین کو ایرانی فاتح، سائرس نے شکست دے کر بنی اسرائیل کو اپنے وطن میں واپس جا کر دوبارہ آباد ہونے اور ہیکل سلیمانی کی تعمیر کی اجازت دی، زبور میں ہے:-

"سو اس نے اُن کے دکھ پر نظر کی، جب کہ اس نے اُن کا نالہ سنا، اور اس نے اُن کے لئے اپنے عہد کو یاد فرمایا، اور اپنی رحمتوں کی فراوانی کے مطابق پچھتایا، اس نے ایسا کیا کہ ان سب نے بھی جو انھیں اسیر کر کے لے گئے، اُن پر ترس کھایا،" (زبور ۱۰۶: ۴۴ تا ۴۶)

"میں خداوند بنی اسرائیل کا خدا یروشلم کی بابت کہتا ہوں کہ وہ آباد کی جائے گی، اور یہوداہ کے شہروں کی بابت کہتا ہوں کہ وہ بنائے جائیں گے، اور میں اس کے ویران مکانوں کو تعمیر کروں گا، جو سمندر کو کہتا ہوں کہ سوکھ جا، اور میں تیری ندیاں سکھا ڈالوں گا، جو خورس کے حق میں کہتا ہوں کہ وہ میرا چرواہا ہے، اور وہ میری ساری مرضی پوری کرے گا، اور ہیکل کی بابت کہ اس کی بنیاد ڈالی جائے گی، خداوند اپنے مسیح خورس کے حق میں یوں فرماتا ہے، کہ میں نے اس کا داہنا ہاتھ پکڑا، کہ امتوں کو اس کے قابو میں کروں اور بادشاہوں کی کمریں کھلوا ڈالوں، اور دوہرے ہوئے دروازے اس کے لئے کھول دوں، اور وہ دروازے بند نہ کئے جائیں گے، میں نے اس کو صداقت

کے لئے برپا کیا ہے، اور میں اس کی ساری راہیں آراستہ کروں گا، وہ میرا
شہر بنائے گا، اور میرے اسیروں کو بغیر قیمت اور عوض کے چھڑائے گا،

(یسعیاہ ۴۰: ۶ ۲ تا ۲۸)

"خورس بادشاہ کی سلطنت کے پہلے سال مجھ کو خورس بادشاہ نے خدا کے گھر کی بابت جو یروشلم میں ہے، حکم کیا کہ وہ گھر اور وہ مکان جہاں قربانیاں کرتے ہیں، بنایا جائے، اور اس کی بنیادیں مضبوطی سے ڈالی جائیں، اور خرچ بادشاہ کے خزانہ سے دیا جائے، اور خدا کے گھر کے سنہرے روپہلے برتن بھی جنھیں بنوکد نذر یروشلم کی ہیکل سے نکال لایا اور بابل میں لا رکھا، سو پھیر دیئے جائیں اور یروشلم کی ہیکل میں اپنی جگہ رکھ دیئے جائیں یعنی خدا کے گھر میں رکھ دیئے جائیں (عزرا ۶: ۱-۵)

(باقی)

تذکرۃ المحدثین

از ضیاء الدین اصلاحی

سلسلہ صحابہ و تابعین و تبع تابعین کے بعد اسلام کے سب سے زیادہ مقدس طبقہ محدثین کرام کا سلسلہ اب شروع کیا گیا ہے، جس کے دو حصے شائع ہو کر ارباب علم سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں، اور دو حصے زیر تالیف ہیں، جن میں سے ایک حصہ ہندوستان کے محدثین کرام کے حالات اور ان کی ہندوستان میں حدیثی خدمات اور کارناموں پر مشتمل ہوگا، اور یہی حصہ پہلے شائع ہوگا۔

پہلا حصہ امام مالک اور ائمہ صحاح اور دوسری صدی ہجری کے آخر سے چوتھی صدی ہجری کے اوائل تک کے مشہور صاحب تصنیف محدثین کے حالات و سوانح پر مشتمل ہے، اور دوسرا حصہ چوتھی صدی سے آٹھویں صدی ہجری تک کے اکثر مشہور صاحب تصنیف محدثین کے حالات اور ان کی حدیثی خدمات پر مشتمل ہے، قیمت حصہ اول ۷۵-۱۳ حصہ دوم -۱۶

منیجر

الموافقات شاطبی

(اسلامی قانون کی ایک اہم کتاب)

از

محمد نعیم صدیقی ندوی ایم، اے (علیگ)

ابو اسحاق شاطبی (المتوفی ۷۹۰ھ / ۱۳۸۸ء) علمائے اسلام میں بڑی جامع اور ہمہ گیر شخصیت کے حامل تھے، حدیث و تفسیر، فقہ و تصوف، لغت و بلاغت اور اصول فقہ میں ان کو کامل درک حاصل تھا، ان کا شمار اسلامی قانون کے ان چند منتخب ماہرین میں کیا جاتا ہے، جن کے مخصوص افکار اور مجتہدانہ نظریات نے پورے عالم اسلام کے قانون ساز علماء کو متاثر کیا ہے، شاطبی کی شہرۂ آفاق تصنیف "الموافقات فی اصول الاحکام" آج تک اصول فقہ اسلامی کا مطالعہ کرنے والوں کا اہم ماخذ ہے، خاص طور پر شاطبی کا مخصوص نظریۂ "مصلحت" (جس کی مبسوط وضاحت آیندہ کی جائے گی) جدید قانون سازی میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے، اس کتاب کی اہمیت کا کچھ اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ مصر کے شہرۂ آفاق عالم مفتی محمد عبدہ اپنے تلامذہ اور اہل تعلق کو "تشریع اسلامی کا ادراک پیدا کرنے کے لئے الموافقات کے مطالعہ کا برابر مشورہ دیا کرتے تھے، جیسا کہ محمد الخضری بے نے اپنی کتاب "اصول الفقہ" کے دیباچہ میں ذکر کیا ہے کہ انھیں اسلامی قوانین کو سمجھنے کے لئے الموافقات کا مطالعہ کرنے کا مشورہ محمد عبدہ ہی نے دیا تھا، مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے اپنی تصنیف "آئین و قوانین اسلام" میں پاکستان میں اسلامی قوانین کے نفاذ کے سلسلہ میں الموافقات کا قومی زبانوں میں ترجمہ کئے جانے کی پرزور سفارش کی ہے تاکہ وہاں کے ماہرین قانون اسلامی فقہ کی روح

ومقصد سے پورے طور پر ہم آہنگ ہوسکیں.

اس موضوع پر بعد میں جتنی بھی کتابیں منصۂ شہود پر آئیں، سب کے مصنفین شاطبی ہی کی خوشہ چینی اور الموافقات کا طواف کرتے نظر آتے ہیں، خاص طور پر عصر حاضر کے جدید علماء، مثلاً ابوزہرہ، معروف الدوالیبی، محمد الخضری، مصطفےٰ الزرقاء اور یوسف موسیٰ وغیرہ اصول فقہ سے متعلق اپنی تصانیف میں قدم قدم پر شاطبی کے حوالوں کو اپنی تحقیقات میں وزن ووقار پیدا کرنے کے لئے ضروری خیال کرتے ہیں، شاطبی کے علوئے مرتبت اور جلالت شان کی حد یہ ہے کہ علامہ رشید رضا مصری نے اپنی کتاب "تاریخ الاستاذ الامام شیخ محمد عبدہ" کے مقدمہ میں انھیں آٹھویں صدی ہجری کے مجددین میں شمار کرتے ہوئے ان کے علمی کارناموں کو ابن خلدون کے ہم پایہ قرار دیا ہے، فاضل بن عاشور اور عبد المتعال الصعیدی نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ شاطبی اپنی اہمیت وعظمت اور قانون شریعت کی روح ومقاصد کی جو انھوں نے تشریح ووضاحت کی ہے اس کے باعث امام شافعی سے بھی فائق ہیں، جنھیں اصول فقہ کا ابو الآباء قرار دیا جاتا ہے محمد الخضری نے اُصول الفقہ' میں الموافقات سے بھرپور استفادہ کا صریحی اعتراف کیا ہے، اس کے مقدمہ میں انھوں نے مدلل وضاحت کی ہے کہ شاطبی کے مخصوص فقہی نظریات نے اسلامی قوانین کی اس اصل روح کو اجاگر کیا ہے جسے عہد وسطیٰ کے ماہرین قانون اسلامی نے نظر انداز کر دیا تھا.

لیکن شاطبی کی اس تمام اہمیت کے باوجود نہایت تعجب وحیرت کی بات ہے کہ ابھی تک ان کی حیات وکارناموں اور فقہی افکار کا کوئی باضابطہ اور منظم مطالعہ نہیں کیا گیا ہے، ان کے معاصرین میں لسان الدین ابن الخطیب (المتوفی ۷۷۶ھ) اور ابن خلدون (المتوفی ۸۰۸ھ) نے غرناطہ اور اس عہد کے بکثرت اہل قلم کا تفصیلی تذکرہ قلمبند کیا ہے، لیکن انھوں نے بھی شاطبی کو قلم انداز کر دیا ہے، قابل ذکر بات یہ ہے کہ ابن الخطیب شاطبی کے ہم درس تھے، اس لئے یہ شبہ بھی نہیں کیا جاسکتا

کہ وہ ان سے ناواقف تھے، اسی طرح طبقات مالکیہ کے مصنفوں میں شاطبی کے ہم عصر ابن فرحون (المتوفی ۷۹۹ھ) نے الدیباج المذہب تصنیف کی اور بدر الدین القرافی (المتوفی ۱۰۰۸ھ) نے توشیح الدیباج کے نام سے اس کا تکملہ لکھا، لیکن ان دونوں نے بھی شاطبی کا کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے، الموافقات کے ایک مرتب عبد اللہ دراز نے خیال ظاہر کیا ہے کہ "چونکہ شاطبی کے فقہی افکار نہایت دقیق، پیچیدہ اور عسیر الفہم ہیں اس لئے محققین ان پر قلم اٹھانے میں دقت محسوس کرتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ شاطبی کے نظریات کی افادیت واہمیت کو پورے طور پر محسوس کرنے کے لئے صرف فقہی وسعت معلومات کافی نہیں بلکہ اصول فقہ کے تدریجی ارتقاء، اس کے عہد بعہد کے تغیرات اور فلسفہ وتصوف سے کما حقہٗ واقفیت بھی ضروری ہے. اور اس سے بھی زیادہ ضروری یہ ہے کہ شاطبی کے دور میں ہونے والی سیاسی، معاشی اور سماجی تبدیلیوں سے بھی واقفیت پیدا کی جائے اس پس منظر کے بغیر ہمیں شاطبی کے بعض مخصوص نظریات وافکار باہم متضاد، مبہم اور ناقابل فہم معلوم ہوں گے، ان ہی تمام وجوہ نے الموافقات جیسی قابل قدر تصنیف کے گہرے وتفصیلی مطالعہ کی ہمیشہ حوصلہ شکنی کی ہے."

راقم کی تلاش وتحقیق کے مطابق شاطبی کی وفات کے تقریباً دو سو برس کے بعد لکھی گئی احمد بابا ٹمبکتی[1] (المتوفی ۱۰۳۶ھ) کی نیل الابتہاج بتطریز الدیباج وہ پہلی کتاب ہے جو شاطبی کی

---

[1] احمد بابا کا پورا نام ابو العباس احمد بن احمد الصنہاجی ہے، ٹمبکٹو کے اروان نامی ایک گاؤں میں ۲۱ ذی الحجہ ۹۶۳ھ/۱۵۵۶ء کو پیدا ہوئے، اپنے عہد کے مشہور صاحب کمال اہل علم اور جامع الفنون شخصیت کے حامل تھے، خاص طور پر فقہ اور سوانح نگاری میں یگانۂ عصر تھے، انھوں نے فقہ مالکی، صرف ونحو اور دوسرے موضوعات پر تقریباً پچاس کتابیں لکھی ہیں، لیکن ان کا سب سے عظیم تصنیفی کارنامہ فقہائے مذہب مالکیہ کے اس تذکرے کا تتمہ وتکملہ ہے جسے چودہویں صدی کے نصف ثانی میں ابن فرحون مالکی نے الدیباج المذہب فی معرفۃ

سوانح حیات کا اولین ماخذ قرار دی جا سکتی ہے اور بعد کے محققین جنھوں نے شاطبی پر کچھ لکھا ہے، وہ احمد بابا ہی کے تذکرے کو اپنا ماخذ بناتے ہیں، یہ کتاب احمد بابا نے مراکش میں اپنی قید کے زمانہ میں تصنیف کی تھی، ان کو شاطبی سے غیر معمولی عقیدت تھی، جس کا اظہار نیل میں شاطبی کے تذکرہ کی ہر سطر سے ہوتا ہے، ایک جگہ وہ رقمطراز ہیں:

"نویں صدی ہجری میں بعض علماء اپنے درجہ اجتہاد تک پہونچ جانے کا خود اعلان کرتے ہیں، جب کہ امام شاطبی اور حفید بن مرزوق خود کو اس کا اہل نہیں سمجھتے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں ہی علماء مذکورۃ الصدر اہل علم سے بہت زیادہ اجتہادی منصب کے مستحق ہیں" (ص ۴۱۷)

یوں تو اس مضمون میں شاطبی کے سوانح و کمالات کے لئے راقم سطور کے پیش نظر تمام دستیاب ماخذ رہے ہیں، لیکن نیل الابتہاج سے خصوصی استفادہ کیا گیا ہے، شاطبی کا پورا نام ابو اسحاق

اعیان علماء المذہب کے نام سے تالیف کیا تھا، احمد بابا نے اپنی اس یادگار تصنیف کا نام نیل الابتہاج بتطریز الدیباج رکھا، اس کتاب کی تکمیل مراکش میں ۱۰۰۵ھ / ۱۵۹۶ء میں ہوئی، اس کے بعد مصنف نے اس کا خلاصہ بھی شائع کیا جس میں صرف ان مالکی نقہا کو لیا ہے جو ابن فرحون کی کتاب میں درج ہونے سے رہ گئے تھے اس کا نام کفایۃ المحتاج لمعرفۃ مالیس فی الدیباج ہے، نیل مراکش سے ۱۳۱۷ھ میں علیحدہ سے بھی طبع ہو چکی ہے اور الدیباج کے حاشیہ پر بھی ۱۳۲۹ھ میں طبع ہوئی۔

احمد بابا کی یہ قاموس سولہویں صدی کے آخر تک المغرب کے مشہور علماء اور ان کی تصانیف کے بارے میں معلومات کا ایک بیش قیمت ماخذ ہے، مالکی مذہب کے فقہاء کے علاوہ اس میں اس زمانے کے بڑے بڑے مراکشی صوفیہ اور اہل دل کے متعلق بھی معلومات ملتی ہیں، احمد بابا نے ۶ شعبان ۱۰۳۶ھ مطابق ۲۲ اپریل ۱۶۲۷ء کو اپنے وطن میں وفات پائی۔

ابراہیم بن موسیٰ بن محمد ہے، ان کے خاندان، ولادت اور عہد طفولیت کی دوسری تفصیلات سے تمام تاریخیں خاموش ہیں، صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ غرناطہ میں پروان چڑھے اور وہیں ان کی تعلیم مکمل ہوئی، اس وقت بنی نصر کی حکومت کا آفتاب اقبال بلند تھا، شاطبی نے سلطان محمد خامس کا زمانہ پایا تھا جو علمی و فنی ترقی کے اعتبار سے ایک عہد روشن شمار ہوتا ہے، علماء و فضلاء کی کثرت اور علمی چرچوں کے باعث سرزمین غرناطہ رشک آسمان بنی ہوئی تھی، شمالی افریقہ کے دور دراز خطوں کے طلبہ اور اہل علم جوق در جوق اس مرکز ثقل کی طرف کھنچے چلے آتے تھے، چنانچہ شاطبی کو اپنے عہد کے یگانۂ فن اساتذہ سے تلمذ کا شرف حاصل ہوا تھا، دستور زمانہ کے مطابق انھوں نے اپنی تعلیم کا آغاز عربی اصول و قواعد اور ادب و لغت سے کیا تھا، جس کی تحصیل انھوں نے ان فنون کے دو ماہرین ابو عبداللہ محمد بن علی الفخار البیری (المتوفی ۷۵۴ھ) اور ابوالقاسم الشریف السبتی (المتوفی ۷۶۰ھ) سے کی تھی۔

اول الذکر اپنے نحوی کمال کے باعث اندلس میں سیبویہ العصر کے لقب سے مشہور تھے، ابن عماد حنبلی نے لکھا ہے کہ:

قل فی الاندلس من لم یاخذ عنه من الطلبة.	اندلس میں خال خال ہی کسی طالب علم نے ان سے استفادہ نہ کیا ہوگا۔

امام شاطبی ان کی وفات تک مسلسل ان کے دامن فیض سے وابستہ رہے، الافادات میں شاطبی نے ابن الفخار سے عربی زبان کی جامع تعلیم حاصل کرنے کا بصراحت ذکر کیا ہے، اسی طرح ابوالقاسم الشریف السبتی بھی اندلس میں عربی لسانیات پر اپنے غیر معمولی عبور کے باعث "خدا کی روشن نشانی" خیال کیے جاتے تھے، اکحالہ احمد رضا نے معجم المولفین میں ان کی مقصورہ حازم کی ایک شرح کی نشاندہی کی ہے، اس شرح کے بارے میں صاحب شذرات الذہب کی رائے ہے کہ اس کے مطالعہ سے قلب و دماغ کو روشنی اور انشراح کی دولت ملتی ہے۔

اندلس کے مشہور فقیہ ابو سعید بن لب بھی شاطبی کے ممتاز اساتذہ میں تھے، جن کی مجلس درس ۷۵۴ھ میں مدرسہ نصریہ میں آراستہ تھی، ابن الفخار البیری کی وفات کے بعد وہی غرناطہ کے منصب قضا پر فائز ہوئے، اپنے غیر معمولی فقہی کمال و مہارت کے باعث فتاوی کا مرجع تھے، احمد بابا نے ان کے گوناگوں علمی و عملی کمالات و فضائل کا بہت شاندار الفاظ میں ذکر کیا ہے، امام شاطبی کی فقہ کی مکمل تعلیم ان ہی ابن لب کے سایۂ عاطفت و تربیت کی رہین منت تھی، لیکن بایں ہمہ خود اجتہادی صلاحیت حاصل کرنے کے بعد انھوں نے متعدد مسائل میں اپنے استاذ ابن لب سے برملا اختلاف رائے کا اظہار کیا ہے۔

مذکورۃ الصدر ارباب کمال کے علاوہ شاطبی نے بہت سے ان علماء سے بھی اکتساب علم کیا تھا جو کسی سفارتی مشن پر غرناطہ وارد ہوئے تھے، مثلاً قاضی ابو عبد اللہ المقری (المتوفی ۷۵۹ھ) جب ۷۵۶ھ میں سلطان ابو عنان کی جانب سے ایک سفارت میں غرناطہ آئے تو شاطبی نے ان سے اصول فقہ کی تحصیل کی، امام مقری فقہ مالکی کے ممتاز عالم اور بکثرت علوم کے جامع تھے، سلطان ابو عنان نے عنان حکومت سنبھالنے کے بعد ان کے ساتھ انعام و اکرام کا خصوصی معاملہ کیا اور شہر فاس کے منصب قضا پر مامور کیا تھا، لسان الدین ابن الخطیب نے الاحاطہ میں لکھا ہے کہ عہدۂ قضا سے سرفراز ہونے کے بعد ان کا اصلی جوہر خوب چمکا اور اپنی حق پژوہی کے باعث وہ ہر خاص و عام کے محبوب بن گئے تھے، تصوف میں المقری کی تصنیف کتاب الحقائق والرقائق بہت مشہور ہے، شاطبی کو ان ہی کے فیض صحبت سے سلسلۂ شاذلیہ کے تصوف سے دلچسپی پیدا ہوئی۔

امام شاطبی نے علوم عقلیہ میں اپنے عہد کے دو ممتاز اہل علم ابو علی منصور الزواوی اور ابو عبد اللہ الشریف التلمسانی (المتوفی ۷۷۱ھ) سے مہارت حاصل کی تھی، اول الذکر ۷۵۳ھ میں

اندلس آئے تھے، ابن الخطیب نے عقلی و نقلی علوم میں ان کی جامعیت و مہارت اور حسن کردار کی بہت شاندار الفاظ میں تحسین کی ہے، غرناطہ کے فقہاء سے ان کے معرکے اکثر گرم رہتے تھے اسی باعث مورد الزام قرار دے کر ۷۶۵ھ میں اندلس سے نکال دئے گئے، شاطبی نے الافادات والانشادات میں زواوی کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کے استاذ ابن سفر کے حوالہ سے ذکر کیا ہے کہ امام فخر الدین رازی نے اپنی مشہور تفسیر قرآن میں چار مختلف علوم کی کتابوں سے استفادہ کیا ہے اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان چاروں کتابوں کے مؤلفین معتزلی ہیں، چنانچہ انھوں نے اصول دین اور اصول فقہ کے لئے ابو الحسین کی کتاب "الدلائل" اور "المعتمد"، تفسیر کے لئے قاضی عبد الجبار کی تصنیف "کتاب التفسیر" اور قواعد و بلاغت کے لئے زمخشری کی "کشاف" کو اپنا مشعل راہ بنایا ہے، علامہ شاطبی کے اس انکشاف سے یہ اہم حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ معتزلی علم کلام کے فروغ میں امام رازی کا نمایاں حصہ تھا۔

اصول فقہ سے شاطبی کا خاص شغف

مذکورہ بالا اساطین علم و فن کے دامن فیض سے وابستہ رہ کر خود علامہ شاطبی بھی جامعیت و مہارت کے درجۂ کمال کو پہونچے، لیکن ان کے فکر و شغف کی خصوصی جولانگاہ اصول فقہ تھی، یہ حقیقت ہے کہ اندلس میں اس وقت فقہ و اصول کی طرف نسبۃً اعتناء بہت کم پایا جاتا تھا۔ اصول فقہ کی طرف شاطبی کے غیر معمولی میلان کا خاص سبب ان کا روز افزوں یہ احساس تھا کہ نوع بہ نوع معاشرتی تغیرات کے چیلنج کا مقابلہ کرنے میں فقہ اسلامی کا روایتی انداز ناکافی ہے، چنانچہ وہ اپنی تصنیف "الاعتصام" میں ایک جگہ رقمطراز ہیں:

"جب سے میرے سن شعور کا آغاز اور میرے اندر حصول علم کا شوق پیدا ہوا، ہمیشہ میں دلائل شریعت اور اس کے اصول و فروع کے بارے میں غور و فکر کرتا رہا، میں نے حتی الامکان نہ تو کسی علم کی تحصیل میں کوتاہی کی اور نہ کسی خاص فن کو اپنی خصوصی دلچسپی کا محور

بنایا، میں نے اپنی تمام صلاحیتوں سے کام لے کر خود کو علم کے بحر ذخار میں غرق کر دیا، یہاں تک کہ بعض مرتبہ تو مجھے اپنے فنا ہو جانے کا اندیشہ لاحق ہوا لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے قوت عطا فرمایا اور شریعت کے ان نکتوں کو مجھ پر منکشف کیا، جو میری فہم و تدبر سے بالا تر تھے، چنانچہ خداوند قدوس کی اعانت خاص سے میں برابر منزل کی طرف آگے بڑھتا گیا، میں نے اصول الدین سے متعلق تمام مسائل و فروع پر غور و فکر سے کام لیا، اور یہیں مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ بدعت کیا چیز ہے؟ کون سی بات ناجائز ہے اور کون سی جائز؟ دین کے اصولوں اور فقہ سے مقابلہ کرتے ہوئے میں نے خود کو اس جماعت کا ہم آہنگ و ہم نوا بنانے کی کوشش کی جسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سواد اعظم فرمایا ہے۔" (ج ۱ ص ۹)

شاطبی کے زمانہ میں کسی بھی مسئلہ میں مراعات الخلاف کا اصول عام تھا، جس کے تحت علماء کی باہم مختلف آراء کو یکساں طور پر صحیح تسلیم کیا جاتا تھا، اس رجحان و میلان کی انتہا یہ تھی کہ اختلاف رائے کا ذکر فخریہ کیا جاتا، خود شاطبی نے اپنے اس احساس کا ذکر کیا ہے کہ "امام مالک اور ان کے معاصر علماء کے اقوال کا باہمی اختلاف اکثر میرے ذہن پر حاوی رہتا تھا" اور شاطبی کو اس سے بڑی ذہنی الجھن اور پریشانی لاحق رہا کرتی تھی، چنانچہ اپنے استاذ ابو سعید بن لب سے تحصیل علم کرتے ہوئے اکثر ان کو ایسی پیچیدگیوں سے سابقہ پڑا، وہ ایک جگہ کہتے ہیں:

"ایک بار میں اپنے دوستوں کے ساتھ استاذ ابو سعید بن لب سے ملنے گیا، انھوں نے فرمایا کہ میں تمھیں وہ چند بنیادی اصول بتانا چاہتا ہوں جن پر میں نے فلاں فلاں فتوے میں انحصار کیا ہے، اور میں تم پر یہ امر بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں نے ان اصولوں کی رعایت کیوں ضروری خیال کی، ہم لوگ ابن لب کے فتاوے سے واقف تھے، اس لئے اس کے بارے میں ہم نے ان سے بحث کی، ابن لب نے فرمایا کہ فتویٰ دینے کے سلسلہ میں ایک اہم اصول یہ

ہمیشہ یاد رکھو، تمام علماء اس اصول کو صحیح خیال کرکے اس پر عمل کرتے ہیں، وہ یہ کہ مستفتی سے کبھی سختی سے پیش نہ آیا جائے۔"

اس کے بعد شاطبی لکھتے ہیں کہ:

کنت قبل هذا المجلس تتزادد
علی وجوه الاشکال فی اقوال
مالك واصحابه فبعد ذلك
المجلس شرح الله بنور ذلك
الکلام صدری فارتفعت
ظلمات تلك الاشکالات
دفعة واحدة، ولله الحمد
وجزاه عنی خیرا

اس ملاقات سے قبل امام مالک اور ان کے رفقاء کے بہت سے اقوال مجھے اشکال و تذبذب میں مبتلا کر دیا کرتے تھے، لیکن اس گفتگو کی روشنی سے اللہ جل شانہ نے سینہ کو صاف اور مطمئن کر دیا اور دفعۃً ان اشکالات و پیچیدگیوں کی تاریکی دور ہو گئی، خدا کا شکر ہے، اللہ ابن لب کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

(ذیل الابتہاج ص ۴۸)

اندلس کے بدلتے ہوئے معاشرہ اور تغیر پذیر سیاسی و معاشرتی حالات نے علمائے وقت کے لئے بڑے مسائل پیدا کر دئے تھے، شاطبی نے ان تمام تغیرات و انقلابات سے گہری دلچسپی لی اور متعدد علماء کو خط لکھ کر کئی اہم معاملوں میں ان کی رائے اور عمل سے اپنے اختلافی نقطۂ نظر کا مدلل اظہار کیا اور قوانین شریعت کے بنیادی مقاصد سے متعلق بہت سے اصولی سوالات اٹھائے، ذیل میں بعض مسائل میں علمائے وقت سے شاطبی کے مباحثوں اور اختلاف رائے کا ذکر کیا جاتا ہے:

(۱) غرناطہ کی زوال پذیر اقتصادی حالت کے پیش نظر سلطان نے عوام پر کچھ نئے ٹیکس عائد کئے، فقہائے دین اور علمائے شریعت نے ان جدید محصولوں کو یہ کہکر ناجائز قرار دے دیا کہ

شریعت میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ شاطبی نے اس مسئلہ میں خود اپنے استاذ مفتی ابن لب کی مخالفت کرتے ہوئے یہ استدلال کیا کہ عوامی فلاح و بہبود اگرچہ پوری قوم کی ذمہ داری ہوتی ہے لیکن اس ہنگامی وقت میں یہ ذمہ داری سرکاری خزانے کی طرف منتقل ہو گئی ہے، لہٰذا مصالح کا تقاضا یہ ہے کہ اس مقصد کے لئے عوام حکومت سے اشتراک عمل اور مالی تعاون کریں۔

(۲) ایک عرصہ سے اندلس میں یہ رواج چلا آ رہا تھا کہ جمعہ کے خطبہ میں سلطان یا خلیفۂ وقت کا نام ایک آئینی حکمراں کی حیثیت سے ضرور لیا جاتا تھا۔ الموحدون نے اس رواج میں ایک مزید اضافہ یہ کر دیا کہ نماز جمعہ کے بعد اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے بھی خلیفہ کا ذکر کرنا ضروری قرار پا گیا۔ شاطبی اور بعض دوسرے علماء نے پوری جرأت حق گوئی کے ساتھ اس رواج کے خلاف آواز بلند کی۔ ونشریسی نے المعیار المغرب میں قیاس ظاہر کیا ہے کہ اسی مخالفت کی پاداش میں شاطبی کو امامت سے معزول کر کے ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ اس عہد کے کچھ علماء نے شاطبی کی رائے کی تردید بھی کی اور پورے اندلس و شمالی افریقہ میں عرصۂ دراز تک اس بحث کی گونج سنائی دیتی رہی۔ جن ممتاز علماء نے اس بحث میں حصہ لیا۔ ان میں غرناطہ کے چیف جسٹس ابو الحسن النباحی، ابو سعید بن لب، محمد القشتلی (قاضی فاس) اور ابن عرفہ (قاضی تونس) کے نام خصوصیت سے لائق ذکر ہیں، شاطبی کے تلمیذ رشید ابو بکر بن عاصم (جو بعد میں النباحی کے جانشین ہو کر غرناطہ کے قاضی القضاۃ مقرر ہوئے تھے) وہ واحد شخص ہیں، جنھوں نے شاطبی کے موقف کی حمایت و تائید میں سرگرم حصہ لیا۔

(۳) اس عہد میں سب سے زیادہ بحث و اختلاف کا موضوع مراعات الخلاف کا مسئلہ تھا، جس کے باعث علامہ شاطبی نے اپنے "مقاصد الشریعۃ" کے اصولوں کی تشکیل کی۔ "مراعات" کے اصول نے نہ صرف مختلف مسائل میں فقہاء کے یہاں اختلاف آراء کے وجود کو تسلیم کیا بلکہ اس اہم مسئلہ پر سنجیدگی سے غور و فکر کرنے کی ضرورت پر بھی زور دیا۔ بعض علماء نے تو یہاں تک خیال ظاہر کیا کہ کسی بھی

معاملہ میں پہلے تمام اختلافی آراء کی جستجو لازمی ہے، اور پھر اس کے بعد ان نظریات پر اس طرح عمل کیا جانا چاہئے کہ ان میں سے کوئی بھی رائے نظر انداز نہ ہونے پائے۔ ظاہر ہے اس اصول سے بعض مسائل میں تو بڑی سہولتیں پیدا ہوئیں، مگر اس کے باعث کچھ موقعوں پر دشواریوں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔

علامہ شاطبی نے اصول مراعات کے جواز کو چیلنج کیا اور مختلف علماء مثلاً ابن قباب قشتلی، ابن عرفہ اور شریف التلمسانی وغیرہ کو خطوط لکھے۔ ان علماء نے جواب میں جو وضاحتیں کیں، ان سے شاطبی کو شرح صدر نہ ہو سکا، دراصل شاطبی کا عقیدہ تھا کہ قوانین شریعت میں اختلاف آراء کی گنجائش نہیں ہے، کیونکہ شریعت کے تمام اصول ایک ہی منبع سے پیدا ہوئے ہیں، ہم عصر علماء کی شاطبی کے جو مباحثے اور اختلافات ہوئے ان کے باعث شاطبی نے قوانین شریعت کے منبع و مصدر کی وحدت سے متعلق مسائل کی تحقیق شروع کی اور انھوں نے مقاصد شریعت اور شارع کے اصل غرض و غایت پر بھی تحقیقات کیں، اسی غور و فکر اور تلاش و تحقیق کے نتیجہ میں شاطبی کے مشہور اجتہادی نظریہ "مقاصد الشریعۃ" کے اصولوں نے جنم لیا، جن کی تشریحات ان کی تصنیف الموافقات میں قدم قدم پر ملتی ہیں۔

الموافقات میں شاطبی نے قوانین شریعت کے مروجہ نظریات اور وقت کی عام ہوا کے خلاف اپنے مخصوص و منفرد آراء کا اظہار کیا ہے۔ اس کے باعث ان کو بدعت و الحاد تک کے الزامات کا نشانہ بننا پڑا۔ احمد بابا نے "نیل الابتہاج" میں شاطبی کے حسب ذیل اشعار نقل کئے ہیں، جن سے ان قلبی جذبات و احساسات کی عکاسی ہوتی ہے جو شاطبی کے دل میں علماء وقت کی مخالفتوں اور بدعت کے الزام سے پیدا ہوئے تھے۔ وہ کہتے ہیں:

بلیت یا قوم والبلوی منوعۃ   بمن اداریہ حتی کاد یردینی
دفع المضرۃ لا جلب لمصلحۃ   فحسبی اللہ فی عقلی وفی دینی

(اے میرے اہل قوم! میں نوع بنوع آلام و آزمائشوں میں مبتلا ہو گیا ہوں اور آزمائشیں جس کو گھیر لیتی ہیں، تقریباً فنا کر ڈالتی ہیں، آپ لوگ اس لئے میری مذمت کرتے ہیں کہ میں غلطیوں کا تدارک کر رہا ہوں اور مصلحت کے حصول کے لئے کوشاں ہوں، خدا میرے افکار و عقائد کو پائندہ رکھنے میں میری مدد فرمائے)

علاوہ ازیں خود شاطبی نے الاعتصام میں اپنے مصائب کی داستان بیان کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے

"میں نے متعدد عوامی پیشوں مثلاً وعظ و تبلیغ اور امامت کو اختیار کیا، جب میں نے اپنی راہ کو ہموار کرنے کی کوشش کی تو میں نے خود کو ہم عصر علماء کی جماعت میں منفرد پایا، ان کے یہاں کہنہ روایات اور دیرینہ رسوم و رواج کا غلبہ تھا، میں ایک دوراہے پر اضطراب و کشمکش کے عالم میں کھڑا تھا، ایک راستہ تو میرے لئے یہ تھا کہ دوسرے علماء سے اختلاف رائے کرتے ہوئے میں اپنے نزدیک جادۂ صواب پر قائم رہوں، ایسی صورت میں ظاہر ہے مجھے ان نتائج کے لئے تیار رہنا تھا، جو مسلمہ روایات اور رائج تصورات کے خلاف آواز بلند کرنے والے کو پیش آتے ہیں، خصوصاً ایسے حالات میں جب کہ رواجی انداز فکر کے حامل لوگوں کو یہ ادعا ہو کہ ان ہی کے نظریات "سنت ثابتہ" پر مبنی ہیں۔

دوسری راہ میرے لئے یہ تھی کہ سنت کی خلاف ورزی کرتے ہوئے عام لوگوں کی اتباع کروں اور صراط مستقیم سے منحرف ہو جاؤں، میں نے فیصلہ کیا کہ اتباع سنت کی راہ میں اپنی حقیر جان قربان کر دوں گا، چنانچہ میں نے بہت سے مسائل میں اپنے اس فیصلہ پر عمل کیا، نتیجہ کے طور پر جلد ہی عتاب و مخالفت کا نشانہ بن گیا اور مجھ پر طرح طرح کے الزامات عائد کئے گئے، یہاں تک کہ مجھے بدعت بلکہ کفر کے اتہام میں بھی ملوث کیا گیا۔" (ج ۱ ص ۹ - ۱۱)

الاعتصام ہی میں شاطبی نے ان الزامات کی تفصیل بھی درج کی ہے جو ان کے خلاف

لگائے گئے تھے، چنانچہ وہ رقمطراز ہیں:

"(۱) کہا جاتا ہے کہ میں دعاء کی عدم افادیت کا قائل ہوں، اس الزام کا سبب یہ ہے کہ مجھے نماز کے اختتام پر اجتماعی دعا کے عام رواج سے اتفاق نہ تھا۔

(۲) مجھ پر تشیع و رفض کے ساتھ یہ الزام بھی عائد کیا گیا کہ میں بعض خلفائے اسلام کے خلاف بغاوت کا حامی ہوں، اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ میں جمعہ کے خطبہ میں خلفائے راشدین کے نام ذکر کئے جانے کے رواج کا قائل نہیں تھا۔

(۳) مجھے اس الزام سے بھی متہم کیا گیا کہ میں دین میں جبر اور سختی کا بھی قائل ہوں، اس کی وجہ بظاہر یہ تھی کہ فرائض و فتاوی کے سلسلہ میں صحیح روایات و احادیث کی پابندی میرا معمول تھا جب کہ میری مخالفت کرنے والے علماء اس چیز کو بسا اوقات نظر انداز کر دیتے اور مستفتی کی سہولت و پسند کے مطابق فتوے دے دیا کرتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ فقہائے وقت کے افکار و نظریات کی مخالفت کرنے کے باعث شاطبی پر محض بدنام کرنے کے لئے طرح طرح کے اتہامات عائد کئے گئے، اور تاریخ میں اس کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں، وقت کے رواں دواں دریا کے رخ کو موڑنے والی تمام عبقری شخصیتوں کے چہرے الزامات کی جراحتوں سے داغ دار ہیں، لیکن علم و فن کی بارگاہ میں ایسے افراد کو نمایاں ترین مقام عطا ہوتا ہے، یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ اندلس اور شمالی افریقہ کے ان ہی علماء نے شاطبی کی مخالفت کی جو منصب قضا یا دوسرے سرکاری عہدوں پر مامور تھے۔

شاطبی کے فیضان صحبت سے مستفید ہونے والوں کا حلقہ بھی بہت وسیع ہے، احمد بابا نے ان کے تین نمایاں تلامذہ کا ذکر کیا ہے، جن میں ابو بکر محمد بن عاصم (المتوفی ۸۲۹ھ) خصوصیت کے ساتھ اپنے غیر معمولی فضل و کمال کے باعث شہرت کے آسمان پر مہر و ماہ بن کر چمکے، غرناطہ کے

قاضی القضاۃ بھی مقرر ہوئے، ان کی منظوم کتاب **تحفۃ الحکام فی نکت العقود والاحکام** بہت مشہور ہے، جو عام طور پر عاصمیہ یا تحفۃ ابن عاصم کے نام سے معروف ہے۔ اس کتاب میں قاضیوں کے لئے فقہ مالکی کے اصول مرتب کئے گئے ہیں، یہ الجزائر اور فاس سے متعدد بار طبع ہو چکی ہے۔

شاطبی کی وفات جیسا کہ سطور بالا میں مذکور ہوا، شاطبی کا سال ولادت نامعلوم ہے، لیکن وفات کے بارے میں سب کا اتفاق ہے کہ ۸ر شعبان بروز چہار شنبہ ۷۹۰ھ میں ہوئی۔

تصنیفات ابو اسحاق شاطبی نے مختلف فنون میں قابل قدر کتابیں یادگار چھوڑی ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) **عنوان التعریف باسرار التکلیف**: یہ عام طور پر الموافقات فی اصول الاحکام کے نام سے معروف و متداول ہے، چار جلدوں پر مشتمل اس شہرۂ آفاق تصنیف نے شاطبی کے نام کو حیاتِ جاوید عطا کی ہے، اس کا موضوع اصول فقہ اور شریعت کے اسرار و حکم ہے، اب تک اس کے متعدد اڈیشن طبع ہو چکے ہیں۔

پہلی بار ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۴ء میں تونس سے شائع ہوئی، جسے صالح القائجی، علی الشنوفی اور احمد الودتانی نے مرتب کیا ہے، ۱۳۲۷ھ میں موسیٰ جار اللہ کے ترکی زبان میں مقدمہ کے ساتھ اس کا صرف پہلا حصہ قازان میں بھی چھپ چکا ہے، دوسرا مکمل اڈیشن مطبع سلفیہ قاہرہ سے ۱۳۴۱ھ/۱۹۲۳ء میں طبع ہوا، جسے شیخ الازہر محمد الخضر الحسین نے مرتب کیا ہے، راقم سطور کے پیش نظر الموافقات کا یہی نسخہ ہے، تیسرا اڈیشن شیخ عبداللہ دراز کے قیمتی حواشی و ترتیب کے ساتھ مطبع مصطفیٰ محمد میں طبع ہوا، چوتھا اڈیشن مطبع محمد علی قاہرہ میں چھپا، جسے محمد محی الدین عبدالحمید نے مرتب کیا ہے۔

(۲) **الاعتصام**: تین جلدوں پر مشتمل توحید کی کتاب ہے، اس میں دس ابواب میں بدعت کی

تعریف اور اس کے ماخذ و احکام وغیرہ پر مبسوط بحث کی گئی ہے، سب سے پہلے ۱۹۱۳ء میں اس کتاب کے کچھ اقتباسات علامہ رشید رضا نے اپنے مشہور رسالہ "المنار" قاہرہ میں شائع کئے تھے، پھر موصوف نے اپنے ایک فاضلانہ مقدمہ کے ساتھ مرتب کر کے مکمل کتاب کی اشاعت کی جس کا متن کتب خانہ شنقیطی میں محفوظ الاعتصام کے ایک مستند نسخہ پر مبنی ہے، رشید رضا چونکہ خود بھی بدعت کے خلاف تیغ بے نیام تھے اس لئے انھوں نے الاعتصام پر اپنے مقدمہ میں شاطبی کے موحدانہ افکار و عقائد کو شاندار الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا اور ان کو رد بدعت کا ایک مجاہد ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، علاوہ ازیں پروفیسر مارگولیتھ نے ۱۹۱۶ء میں رسالہ "دی جرنل ایشیاٹک سوسائٹی" میں الاعتصام پر ایک ناقدانہ تبصرہ لکھا تھا، جس میں انھوں نے خیال ظاہر کیا تھا کہ عمیق و دقیق افکار کے باعث یہ کتاب عسیر الفہم ہے۔

(۳) **شرح علی الخلاصۃ فی النحو**: چار ضخیم جلدوں میں الفیۂ امام مالک کی شرح ہے، اس کی افادیت و اہمیت کے بارے میں احمد بابا رقمطراز ہیں کہ

لم یؤلف مثلہ بحثا وتحقیقا کما اعلم — میرے علم و واقفیت کے مطابق بحث و تحقیق کے اعتبار سے اس سے بہتر کتاب نہیں لکھی گئی،

مکتبۃ الازہریہ میں اس کا ایک نادر مخطوطہ محفوظ ہے، جس کا آغاز اس طرح ہے:

"اللھم انا نحمدک علی ما علمت ونشکرک علی ما انعمت"

اس قلمی نسخہ کے کاتب کا نام عمر بن عبداللہ المنظراوی ہے۔

(۴) **کتاب المجالس**: یہ صحیح بخاری کی کتاب البیوع کی نہایت فاضلانہ شرح ہے، احمد بابا نے اعتراف کیا ہے کہ

فیہ من الفوائد والتحقیقات — اس میں جو قیمتی باتیں اور تحقیقات پیش

مایعلمہ الا اللہ۔ کی گئی ہیں، ان کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا ہے،

ان کے علاوہ شاطبی کی تالیفات میں الافادات والانشادات،[1] عنوان الاتفاق فی علم الاشتقاق،[2] کتاب اصول النحو،[3] رسالہ طبی[4] اور فتاوی شاطبی[5] قابل ذکر ہیں جن کے قلمی نسخے دنیا کے مختلف کتب خانوں کی زینت ہیں۔

مراجع: اس مضمون کی تیاری میں حسب ذیل مآخذ سے استفادہ کیا گیا ہے:

۱. نیل الابتہاج بتطریز الدیباج — احمد بابا ٹمبکٹی
۲. نفح الطیب جلد ۷ — مقری
۳. المعیار المغرب — ونشریسی
۴. الاعتصام — شاطبی
۵. الاحاطہ فی اخبار غرناطہ — لسان الدین ابن الخطیب
۶. الموافقات جلد ۱۔ ۴ — شاطبی
۷. شذرات الذہب جلد ۷ — ابن عماد حنبلی
۸. البستان فی ذکر العلماء والاولیاء بتلمسان — ابن مریم المدیونی
۹. المجددون فی الاسلام — عبد المتعال الصعیدی
۱۰. اعلام الفکر الاسلامی — فاضل بن عاشور
۱۱. تاریخ الاستاذ الامام محمد عبدہ، — رشید رضا
۱۲. اصول الفقہ — محمد الخضری
۱۳. معجم المولفین — کحالہ احمد رضا
۱۴. الاعلام جلد ۱ — خیر الدین زرکلی
۱۵. معجم المطبوعات — یوسف سارکیس

تصوّف کا مقصد

از

ڈاکٹر محمد شمس الحق شمسی لکچرر پوسٹ گریجویٹ عربک اینڈ پرشین انسٹی ٹیوٹ، پٹنہ

تصوف کا لفظ قرآن وحدیث میں نہیں آیا ہے، صحابہ کرام کی زبان سے بھی اس لفظ کی ادائگی منقول نہیں، تصوف کی لفظی تحقیق بہت بعد کی ہے۔ کسی کا خیال ہے کہ یونانی لفظ تھیا سوفی کی تعریب ہے، اشراقی فلاسفہ کا انداز فکر، طرز عمل اور ان کی فلسفیانہ نکتہ آفرینیوں اور اشراقی تجربوں کی بنا پر بعض اصحاب علم تصوف کا سلسلہ فلسفۂ اشراق سے ملاتے ہیں اور بعض لوگ اسے اصحاب صفہ کے حلقۂ ذکر سے مربوط کرتے ہیں، بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ لفظ صوف سے بنایا گیا ہے کیونکہ پرانے صوفی اکثر موٹے جھوٹے کپڑے اور اون کی بنی ہوئی پوشاک استعمال کرتے تھے، جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے یہ سب بعد کی موشگافیاں ہیں، تصوف کا لفظ جس طرح بنا ہو اور جیسے بھی رائج ہوا ہو، اس کا مقصد اصلاح نفس تھا اور آج تک ہے، یہ مقصد شریعت کا مقصود اور انبیاء علیہم السلام کی آمد کی غرض وغایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام صرف یہ نہ تھا کہ اللہ کی آیتیں لوگوں کو پڑھ کر سنا دیں، بلکہ آپ لوگوں کو رذائل سے بچا کر اخلاق عالیہ سے آراستہ کرنا چاہتے تھے، قرآن مجید میں تصریح کی گئی ہے:

هوالذی بعث فی الامّیّین رسولاً منهم یتلو علیهم آیاته ویزکیهم ویعلمهم الکتاب

اسی (اللہ) نے ان پڑھوں کے درمیان انھیں میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھتا ہے اور انھیں

والحکمۃ وان کانوا من قبل　　پاکیزہ کرتا ہے اور ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے

لفی ضلال مبین ۔ (جمعہ ۲)　　بے شک اس سے پہلے وہ لوگ صریح گمراہی میں تھے،

اس طرح کی آیتیں کئی جگہ قرآن مجید میں ہیں، ان آیتوں سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام تزکیۂ نفس کی طرف خاص طور سے توجہ کرتے تھے، جس طرح کسی برتن کو قلعی کرنے سے پہلے اچھی طرح مانجا جاتا ہے، کیونکہ جب تک میل کچیل اور داغ دھبے اچھی طرح صاف نہ ہو جائیں برتن میں چمک دمک اچھی طرح پیدا نہیں ہو سکتی ہے، اسی طرح اخلاق حسنہ سے آراستہ کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ دلوں کو گناہوں کی آلائشوں سے صاف کیا جائے اور بدعملیوں کے داغ دھبے دور کئے جائیں، تزکیہ کے بغیر کتاب وحکمت کی تعلیم موثر نہیں ہو سکتی ہے، یہی تزکیۂ نفس تصوف کا مقصود ہے، صوفی گناہوں کو صرف ترک ہی نہیں کرتا بلکہ اس کی جڑیں تلاش کر کے دل کی گہرائیوں سے نکال کر پھینک دیتا ہے، یہ کام آسان نہیں ہے، ہوس چھپ چھپ کر سینوں میں گھر بنانا چاہتی ہے، خواہشات بسا اوقات رذائل کو فضائل کی شکل میں پیش کرتی ہیں، لیکن ایمان واخلاص کے سہارے وہ نفس وشیطان کے جال سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے، اس راہ میں اسے بڑی آزمائشوں سے گذرنا پڑتا ہے اور سخت ریاضت وجانفشانی سے کام لینا ہوتا ہے، اللہ کی حضوری اور معیت کا تصور اس کے لئے ممد ومعاون ہوتا ہے، اسی حقیقت کی طرف حدیث صحیح میں بھی اشارہ کیا گیا ہے، ایک بار حضرت جبرئیل علیہ السلام انسانی شکل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ایمان واسلام کے بارے میں آپ سے سوالات کئے، اس سلسلہ میں انھوں نے یہ بھی دریافت کیا احسان کسے کہتے ہیں، آپ نے فرمایا: احسان اس کا نام ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا اسے دیکھ رہے ہو، لیکن اگر اتنا اونچا تصور تمہارے لئے ممکن نہ ہو تو کم از کم یہ خیال کرو کہ اللہ تمھیں دیکھ رہا ہے، مطلب یہ ہے کہ آدمی جو کام بھی کرے یہ خیال کر لے کہ اللہ کی نظر کے سامنے ہے اور اللہ ظاہر ہی کو نہیں دیکھتا

بلکہ باطن سے بھی باخبر ہے، وہ ارادے اور نیت کو بھی بخوبی جانتا ہے، معمولی طور پر تو ہر مسلمان خدا کے حاضر وناظر ہونے پر ایمان رکھتا ہے لیکن اس لفظی ایمان کو حقیقت کا رنگ دینا بڑا مشکل ہے، اس راہ میں طرح طرح کے پیچ وخم پیش آتے ہیں اور قدم قدم پر شیطان کے جال میں الجھنے کا خطرہ رہتا ہے، لیکن اللہ کی معیت اور حضوری کو عین الیقین کے درجے تک پہونچائے بغیر نہ ایمان کامل ہو سکتا ہے نہ عمل صلاح وتقویٰ سے معمور ہو سکتا ہے، اسی کو قرآن مجید میں اخلاص سے بھی تعبیر کیا گیا ہے:

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ　　انھیں اسی کا حکم دیا گیا ہے کہ اللہ کی بندگی

مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۔　　کے اطاعت وفرماں برداری پورے اخلاص

(بینہ)　　کے ساتھ کی جائے۔

اسی کو حدیث شریف میں حسن نیت کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے: انما الاعمال بالنیات یعنی عمل کا دار ومدار نیت پر ہے، اگر نیت خالص ہوگی تو عمل مقبول ہوگا ورنہ آدمی خواہ کچھ کرے اس کا کوئی عمل مقبول نہیں ہو سکتا ہے، جبتک کہ نیت میں خلوص اور ارادے میں پاکیزگی نہ ہو۔

تصوف کی لغوی تحقیق میں چاہے جو موشگافیاں کی گئی ہوں اور صوفیوں کے تذکرے چاہے جس انداز میں کئے گئے ہوں، حقیقت یہ ہے کہ اپنی روح اور مقصد کے اعتبار سے تصوف شریعت کے منشا کے مطابق ہے، بہت ممکن ہے کہ تصوف کی طویل تاریخ میں کچھ قابل اعتراض باتیں مل جائیں اور بعض صوفیوں کے قول وفعل میں اعتراض کی گنجائش نکل آئے، لیکن اکابر صوفیہ نے ہمیشہ تصریح کی ہے کہ تصوف کتاب وسنت ہی سے ماخوذ ہے اور طریقت شریعت ہی کی عملی شکل ہے، ان بزرگوں نے ہمیشہ اپنے متبعین کو تلقین کی کہ شریعت سے ہٹ کر خدا رسیدگی ممکن نہیں ہے، زندگی جس قدر اللہ کے احکام کے مطابق اور سنت نبوی کے موافق ہوگی اسی قدر راہ ولایت کا سفر آسان ہوگا۔

صوفیہ کرام کے مختلف سلاسل وطبقات میں غالباً سب سے زیادہ مشہور ومقبول بزرگ حضرت

شیخ عبد القادر جیلانیؒ ہیں، فتوح الغیب، فن سلوک پر آپ کی کتاب ہے، اس کتاب کا پہلا مقالہ تعمیل اوامر اور اجتناب نواہی اور رضا بالقدر والقضاء پر ہے، اس میں فرماتے ہیں:

لابد لکل مؤمن فی سائر احوالہ من ثلثۃ اشیاء، امر یمتثلہ ونہی یجتنبہ، وقدر یرضی بہ .....

ہر مومن کے لئے یہ تین چیزیں لازمی ہیں، ایک یہ کہ اوامر الٰہی کی تعمیل کرتا رہے، دوسرے یہ کہ منہیات سے بچتا رہے، تیسرے یہ کہ قضا و قدر الٰہی پر راضی رہے۔

دوسرا مقالہ اتباع سنت اور ترک بدعت پر ہے، آغاز میں ہی فرماتے ہیں:

اتبعوا ولا تبتدعوا واطیعوا ولا تمرقوا.

سنت کی پیروی کرتے رہو، راہ بدعت نہ اختیار کرو، اطاعت کرو اور دائرہ اطاعت سے باہر نہ آؤ۔

ایک جگہ فرماتے ہیں:

ینبغی للمؤمن ان یشتغل اولاً بالفرائض فاذا فرغ منہا اشتغل بالسنن ثم یشتغل بالنوافل والفضائل فمن لم یفرغ من الفرائض فالاشتغال بالسنن حمق ورعونۃ فان اشتغل بالسنن والنوافل قبل الفرائض لم یقبل منہ واھین (فتوح الغیب ص ۴۷،۴۸)

مومن کو چاہئے کہ سب سے پہلے فرائض پر متوجہ ہو، جب یہ ادا کر چکے تب سنتوں کو اختیار کرے، اس کے بعد نوافل پر متوجہ ہو لیکن جو شخص اپنے فرائض سے فارغ نہیں ہوا اس کے لیے سنتوں میں مشغول ہونا حماقت و نادانی ہے، اس لئے کہ ادائے فرائض سے قبل سنن و نوافل غیر مقبول رہیں گے اور جو شخص ایسا کرے گا خوار ہوگا۔

وصال سے ذرا قبل اپنے بڑے صاحبزادے شیخ سیف الدین عبد الوہاب کو وصیت فرمائی:

علیک بتقوی اللہ وطاعتہ ولا تخف احدًا ولا ترج احدًا وکل الحوائج الی اللہ واطلبہا منہ ولا تثق باحد سوی اللہ

خدا کے تقوی اور طاعت کو اپنے اوپر لازم رکھو، بجز خدا کے کسی سے خوف یا امید نہ رکھو، تمام حاجات کو خدا ہی کو سونپو، اور اسی سے طلب کرتے رہو، سوائے خدا کے کسی پر اعتماد نہ رکھو۔

شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردیؒ فرماتے ہیں:

"تصفیہ قلوب و تزکیہ نفوس براہ راست تعلیمات مصطفوی کا ثمرہ ہے، اور جو شخص اس سرچشمہ ہدایت و رشد سے جتنا زیادہ سیراب ہوا، اسی مناسبت سے صفائے قلب و تزکیہ نفس میں بھی اس نے زیادہ ممتاز مرتبہ حاصل کیا۔" (عوارف المعارف ص ۶)

ایک قدیم بزرگ شیخ عبد الواحد بن زیدؒ نے صوفیہ کی تعریف یوں کی کہ

القائمون بعقولہم علی فہم السنۃ والعاکفون علیہا بقلوبہم

اپنی عقل کو سنت رسول پر صرف کرتے ہیں اور اپنے قلوب کو اس پر متوجہ رکھتے ہیں،

شیخ سہروردیؒ اس تعریف کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ:

ھذا وصف تام وصفہم بہ (عوارف المعارف ص ۲۷)

یہ ان (صوفیوں) کی بہترین تعریف ہے جو کی گئی۔

شیخ ہجویریؒ کا ارشاد ہے:

"خلق پر تمام راستے مسدود کر دیے گئے ہیں، سوائے اس کے کہ سنت نبوی کے نقش قدم پر چلا جائے، ہمارا سارا طریقہ کتاب الٰہی و سنت رسول کا پابند ہے۔" (رسالہ قشیری ص ۱۹)

ایک جگہ فرماتے ہیں :

"جو شخص حافظ کلام الہی و عالم احادیث رسول نہیں، اس کی تقلید دربارۂ طریقت درست نہیں، اس لئے کہ ہمارے اس سارے علم (سلوک) کا ماخذ قرآن و حدیث ہیں" (رسالہ قشیری ص ۱۹)

عہد رسالت اور دور صحابہ میں تعلیم و تزکیہ اور احسان و اخلاص کا یہی رنگ قائم رہا، صحابہ کرام سبھی اس راہ پر گامزن تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت نے ان کے دل و دماغ کو اتنا اور اس قدر منور کر دیا تھا کہ باطل ان کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا تھا، خلافت راشدہ کے بعد جب نظام حکومت میں تغیر ہوا اور آگے چل کر بادشاہوں کا عمل دخل بڑھا اور متاع دنیوی مطمح نظر بننے لگی تو اس کا اثر پورے مسلم معاشرے پر پڑا، بادشاہوں اور امیروں کی دیکھا دیکھی ملت کے دوسرے طبقے لذات دنیاوی کی طرف مائل ہو گئے، کلمۂ حق کہنا دار پر چڑھنے کا مرادف تھا، اس زمانہ میں دین کو بچانے اور اخلاص و احسان کی روح کو زندہ رکھنے کیلئے منظم کوشش کی ضرورت صلحائے امت کو محسوس ہوئی اور تابعین اور تبع تابعین کے دور میں بہت سے لوگوں نے دنیا کے جاہ و منصب اور دولت و حشمت سے صرف نظر کر کے اپنی پوری زندگی لوگوں کے اصلاح حال میں صرف کر دی، یہیں سے ہمیں صالحین و مصلحین کا ایک گروہ مصروف کار نظر آتا ہے، حضرت حسن بصری رح، حضرت سفیان ثوری رح، حضرت اویس قرنی رح، حضرت ابن سیرین رح، حضرت سید ابو سعید رح، حضرت سعید بن المسیب رض، حضرت قاسم بن محمد رض، حضرت جعفر صادق رح اور ان کے ساتھیوں نے خاص طور سے اس اہم کام کی طرف توجہ کی، ان بزرگوں نے وقت کی سیاست سے اپنے دامن کو پورے طور سے بچایا، ترک دنیا حقیقی صوفیہ کا مقصد نہ تھا لیکن لوگوں کی اصلاح کے لئے ترک دنیا ناگزیر تھی، کیونکہ امراء و سلاطین کو اگر ذرا بھی شبہہ ہو جاتا تو پھر کام کا کیا ذکر ہے جان کی بھی خیر نہیں تھی، چنانچہ ہر طرح کی احتیاط کے باوجود بہت سے بزرگوں کو جان سے ہاتھ دھونا پڑا، یہ سلسلۂ رشد و ہدایت آئندہ نسلوں میں بھی جاری رہا، خالص محدثانہ بحث کے اعتبار سے ممکن ہے کہیں کہیں مرشد و مسترشد کے درمیان ملاقات ثابت نہ ہو، لیکن مجموعی طور پر ایک طبقہ

دوسرے طبقہ سے کسب فیض کرتا رہا اور بزرگوں کی تعلیمات و ہدایات کو آئندہ نسلوں کی طرف منتقل کرتا رہا، حضرت حسن بصری رح کے بارے میں علمائے اسماء الرجال کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ حضرت علی رض سے ان کی ملاقات نہیں ہوئی، لیکن ان کے بچپن کا ابتدائی زمانہ مدینہ منورہ میں گذرا، پھر بعد کو وہ بصرہ آئے، اگر مدینہ منورہ میں ان کی عمر کم مانی جائے تو بصرہ میں تو وہ سن شعور کو پہونچ چکے تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ بصرہ میں کافی دنوں رہے، اس لئے حضرت حسن بصری کی ان سے ملاقات ممکن ہے اور سند میں اتصال کیلئے امکان لقاء کافی ہے، جیسا کہ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب صحیح کے مقدمہ میں دلائل سے اس کو ثابت کیا ہے۔

بعد کے لوگوں میں حضرت فضیل بن عیاض رح، شفیق بلخی رح، حبیب عجمی رح، حاتم اصم رح، بایزید بسطامی رح، ذوالنون مصری رح، بشر حافی رح، جنید بغدادی رح، ابو بکر شبلی رح، اسد محاسبی رح، شیخ علی ہجویری رح، ابوالقاسم قشیری رح، امام غزالی رح، شیخ عبدالقادر جیلانی رح، شیخ شہاب الدین سہروردی رح، خواجہ بہاء الدین نقشبند رح، خواجہ عثمان ہارونی رح، خواجہ عبدالواحد رح، خواجہ معین الدین چشتی رح، بیشمار اشخاص نے بندگان خدا کو راہ حق دکھائی اور اپنی تعلیم و تلقین سے لاکھوں انسانوں کے دلوں کا زنگ دور کیا اور ان کے قلوب کو نور عرفان سے منور کیا۔

ہمارے ملک ہندوستان میں بھی بہت سے نفوس قدسیہ پہونچے اور ان کی بدولت اس ملک میں بھی فیضان حق کے چشمے رواں ہوئے، حضرت خواجہ معین الدین چشتی رح، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رح، شیخ فرید الدین گنج شکر رح، نظام الدین اولیا رح، شیخ بہاء الدین ملتانی رح، خواجہ کلیم اللہ جہان آبادی رح، خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی رح، سید محمد گیسو دراز، مخدوم احمد یحیٰی منیری، مخدوم شرف الدین احمد، مخدوم جہانیان جہاں گشت رح، مخدوم جہانگیر اشرف رح، شاہ مینا لکھنوی رح، شاہ عبدالرزاق بانسوی رح، شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی، مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی رح، حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، حضرت شاہ بدر الدین پھلواروی رح، مولانا رشید احمد گنگوہی رح، مولانا محمد علی مونگیری رح وغیرہ بے شمار بزرگان دین گذرے ہیں جن کے نام لیوا آج بھی باقی ہیں اور اپنے بزرگوں کی طرح رشد و ہدایت کے کام میں لگے ہوئے ہیں، تصوف کی تاریخ میں بہت سے

نازک مقامات آتے ہیں اور بعض صوفیہ کے پیچیدہ اقوال نظر سے گذرتے ہیں، بہت سے لوگوں نے ان اقوال کو مرکز بحث و توجہ بنا لیا ہے اور موافقت و مخالفت میں تصانیف کے انبار لگ گئے ہیں، جذب و سکر، وجد و حال، وجود و شہود کے مباحث سے کتب خانے بھر گئے ہیں، لیکن یہ مسائل تصوف کا اصل مقصود نہیں ہیں بلکہ علم و نظر اور احساسات و تجربات کے کچھ اشارے ہیں، اذکار و اشغال اور فکر و ریاضت کے دوران کچھ مناظر نظر کے سامنے آتے ہیں اور بعض اصحاب کی زبان سے غلبۂ حال کی بنا پر کچھ الفاظ نکل جاتے ہیں، لیکن جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے اکابر صوفیہ نے بار بار یہ تصریح کی ہے کہ کتاب و سنت سے سر مو تجاوز درست نہیں ہے، قرآن و حدیث ہی علم کا سرچشمہ اور حقیقت کا معیار ہے، کسی حال میں شریعت سے انحراف جائز نہیں ہے، شاہراہ نبوت سے ہٹ کر ولایت کی منزل تک پہونچنا ناممکن ہے، اس موقع پر یہ بات ذہن میں رہے تو ان مسائل کو سمجھنے میں آسانی ہوگی کہ افکار و خیالات پر زمانہ کے علوم و معارف کا اثر پڑتا ہے، ابتدائے اسلام میں عرب میں منطق و فلسفہ اور نجوم و ہیئت وغیرہ علوم رائج نہ تھے، قرآن مجید اور احادیث میں مخاطبین کی حالت کے پیش نظر سادہ طریقہ سے دینی مسائل بیان کر دئے گئے، جو مسائل روزمرہ کی عملی زندگی سے تعلق رکھتے تھے ان پر عمل کر کے مسئلہ کو مزید واضح کر دیا گیا، لیکن جن امور کا تعلق غیبی حقائق سے تھا، ان کے بارے میں زیادہ غور و فکر اور بحث و مباحثہ سے منع کر دیا گیا تاکہ تعبیر میں غلطی نہ ہو، کیونکہ قرن اول کی معمولی غلطی آئندہ عظیم الشان غلطیوں کی بنیاد بن جاتی، اسی لئے ان مسائل پر سوالات سے منع کیا گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی صحابہ کو بڑی تاکید کی کہ جو ضروری باتیں انھیں بتائی جائیں ان کو سمجھیں اور عمل کریں، لیکن غیر ضروری امور کے بارے میں سوال نہ کریں، کیونکہ سوالات سے آئندہ کے لئے دشواریاں اور پیچیدگیاں پیدا ہونے کا احتمال تھا، اس طرح صحابۂ کرام کو اس کا عادی بنا دیا گیا کہ سوال سے احتراز کریں، عہد صحابہ کے بعد جب عباسی عہد میں یونانی علوم و فنون کے ترجمے شائع ہوئے اور گھر گھر نئے خیالات و افکار پر

بحثیں ہونے لگیں، اس زمانہ میں شریعت کے سادہ مسائل بحث و نظر کا موضوع بن گئے اور توجیہ و تاویل کے دروازے کھل گئے، ایک زمانہ تک راسخ العقیدہ مسلمان ان مباحث کو بری نظر سے دیکھتے رہے، محدثین کے حلقوں میں فلسفیانہ موشگافیوں کو بہت ناپسند کیا جاتا تھا، لیکن رفتہ رفتہ ان عقلی علوم کا عام رواج ہوگیا اور ان کے اثر سے ذہنوں میں نئی نئی الجھنیں پیدا ہونے لگیں، ان حالات میں علم کلام کی بنیاد پڑی تاکہ دینی حقائق کو علم و استدلال سے بھی ثابت کیا جائے اور عقل کو نقل کے ماننے پر مجبور کیا جائے، اسی صورت حال سے صوفیہ کو دوچار ہونا پڑا، ان کے صاحب علم و نظر اصحاب نے ان علوم سے بھی واقفیت حاصل کی، مشائیین کے ساتھ انھوں نے اشراقیین کے افکار و خیالات سے بھی واقفیت حاصل کی، نیز ان کے گرد و پیش ریاضتوں اور اصلاح نفس کے جو طریقے رائج تھے، ان سے بھی واقفیت حاصل کی، اور خود اپنے تجربوں سے انھیں جانچ کر صحیح و غلط میں امتیاز کیا، امام غزالیؒ، امام فخر الدین رازیؒ، شیخ محی الدین ابن عربیؒ، ذوالنون مصریؒ وغیرہ بہت سے اصحاب یونانی علوم و فنون سے بخوبی واقف تھے، ان لوگوں کی تحریروں میں دینی مسائل کی تشریح اس طرح کی جاتی ہے کہ عقلیت پسند بھی اس سے متاثر ہوں، اسی طرح واردات قلبی و مشاہدات باطنی کے بیان میں کہیں کہیں فلسفیانہ زبان استعمال کی گئی ہے، اگر ان کے بیانات غور سے پڑھے جائیں اور ان کے باطنی مشاہدات کا اچھی طرح تجزیہ کیا جائے تو وقت کے افکار اور عقلی استدلال کی جھلک صاف نظر آتی ہے، جس طرح متکلمین کی تعبیر اور انداز بیان پر محدثین نے شروع میں بڑی دار و گیر کی تھی، اسی طرح ان فلسفہ داں صوفیوں کے طرز بیان اور انداز تعبیر پر بھی راسخ العقیدہ مسلمانوں نے اعتراض کیا، جس طرح متکلمین کے مختلف مکاتب فکر تھے، اسی طرح فلسفہ و حکمت سے واقف اور ریاضت و صفائی باطن کے مختلف طریقوں سے آشنا صوفیہ کے یہاں بھی تعبیر و انداز بیان کے اعتبار سے مختلف طبقے ہیں، گو متکلمین کی طرح ان کی حلقہ بندی نہیں کی گئی، مگر ان کے درمیان بھی بڑا تفاوت تھا۔

لاہور کے علمی تحائف

از سید صباح الدین عبد الرحمٰن

(۴)

ماہ نو کا اقبال نمبر: یہ ۴۳۰ صفحے پر مشتمل ہے، ماہ نو حکومت کی سرپرستی میں شائع ہوتا رہتا ہے، پاکستان کا مقبول ماہانہ مجلہ ہے، اس میں گذشتہ تیس سال سے علامہ اقبال پر جتنے مضامین شائع ہوئے، ان ہی کا بہت اچھا انتخاب ہے، اسی لئے اس میں بہت سے مرحومین مثلاً میاں بشیر احمد، ڈاکٹر محمد دین تاثیر، خلیفہ عبد الحکیم، ڈاکٹر عندلیب شادانی، مولوی عبد الحق اور ضیاء الدین احمد برنی کے بھی مضامین پڑھنے میں آئے، علامہ اقبال پر جتنا بھی کچھ لکھا جائے گا، پھر بھی بہت کچھ لکھنے کو باقی رہ جائے گا، وہ تو نظر و فکر اور شعر و ادب کے ترشے ہوئے کوہ نور ہیں کہ جس پہلو اور جس زاویہ سے ان کو دیکھا جائے گا ان میں طرح طرح کے انوار نظر آئیں گے، اس نمبر میں ان کے نظریۂ فن ادب، خون جگر کی نمود، مذہبی شعور، تصور الٰہ، انسانی پہلو، تصور فقر، تصور عشق، تصور معاشرہ، تصور تعلیم، احترام آدمی، نظریۂ حرکت وغیرہ پر مفید مضامین ہیں، اقبال مولانا روم سے جس طرح متاثر ہوئے، اس پر خلیفہ عبد الحکیم، ڈاکٹر سید محمد عبد اللہ، رفیق خاور اور میاں بشیر احمد کے بہت اچھے مقالات ہیں، میں نے ذاتی طور پر جناب بشیر احمد ڈار صاحب کا مقالہ "اقبال اور نطشے" کو بہت ہی شوق اور غور سے پڑھا، اور جب اس کو ختم کیا تو مجھ کو خوشی ہوئی کہ اس میں وہی ساری باتیں قلمبند کی گئی ہیں جو میرے

تحت الشعور میں تھیں، جناب بشیر احمد ڈار اقبال کے متعلق جو کچھ لکھ دیں اس کو بہت ہی غور سے پڑھنے کی ضرورت ہے، کیونکہ اقبال شناسی میں ان کا مرتبہ بہت ہی بلند اور ارفع ہے، عام طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ اقبال کے ہاں انسان کامل کا تصور نطشے سے ماخوذ ہے، مگر ڈار صاحب نے علامہ اقبال کی تحریروں سے یہ ثابت کیا ہے کہ انسان کامل کا جو نقشہ نطشے کے ذہن میں تھا، وہ اقبال کے لئے کسی طرح بھی قابل قبول نہیں تھا، ڈار صاحب نے اسرار خودی کے مقدمہ انڈین اینٹی کیوری میں علامہ اقبال کے ایک مضمون ۱۹۲۶ء میں ایک انگریزی مورخ کے سوال کے جواب میں علامہ اقبال کی ایک انگریزی تحریر اور آخر میں علامہ اقبال کی تشکیل جدید کے آخری خطبہ کے ایک اقتباس سے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ کامل انسان کا ایک تخیلاتی نقشہ نطشے کے ذہن میں ضرور موجود تھا، لیکن بدقسمتی سے الحاد اور اشتراکی تعصبات سے وہ گمراہ ہوگیا، جب اقبال نے انسان کامل کے متصوفانہ عقیدے پر قلم اٹھایا تھا تو نطشے کے عقائد کا غلغلہ ان کے کانوں تک نہ پہونچا تھا اور نہ اس کی کتابیں ان کی نظروں سے گذری تھیں، اقبال کے خیال میں نطشے کے فوق البشر کا تصور سرتاسر مادیت پر مبنی ہے، یہ حیاتیاتی پیداوار ہے، اس کے برخلاف علامہ اقبال کا اسلامی انسان کامل روحانی عوامل کے نتیجے میں ظاہر ہوتا ہے، علامہ اقبال نطشے کو ذہین اور فطین ضرور سمجھتے رہے، مگر ان کا خیال ہے کہ وہ اپنی ذہانت اور فطانت کی بدولت ضائع ہوگیا، وہ اپنی اندرونی قوتوں سے زندگی کی جھلک ضرور دیکھتا رہا، مگر یہ جھلک لاحاصل اس لئے ثابت ہوئی کہ اسے کوئی مرشد کامل نہ ملا، جو اس کی رہنمائی کرتا، اقبال اس کو مجذوب فرنگی کہتے ہیں، اور اپنے ایک شعر میں کہہ گئے ہیں:

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں تو اقبال اس کو سمجھاتا مقام کبریا کیا ہے

اور یہ بھی کہتے ہیں:

کاش بودے در زمان احمدے   تا رسیدے بر سرود سرمدے

اگر محنت و ریاضت کی جائے تو یہ بھی ثابت کیا جا سکتا ہے کہ اقبال نے فشتے، شوپنہار، اور برگساں وغیرہ جیسے مغربی مفکرین کے خیالات کو بھی اسی طرح رد کیا ہے، جس طرح انھوں نے نطشے کے افکار کو کیا ہے، یہ کوئی دعوی نہیں کرتا کہ اقبال مغربی مفکرین کی دھاروں سے بے نیاز رہے، بلکہ انھوں نے تو ان کا گہرا مطالعہ کیا، مگر جیسا کہ پہلے کہا گیا، مطالعہ کرنے میں ان سب کو اسلام کے بنیادی اصولوں پر پرکھنے کی کوشش کی، اگر وہ اسلامی عقائد کے مطابق تھے تو ان کو قبول کیا، ورنہ ان کو رد کیا اور اگر قبول کیا تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ان سے متاثر ہوئے، بلکہ ہم اپنے استاذ محترم کے الفاظ کو پھر یہ لکھ کر دہراتے ہیں کہ انھوں نے علوم الٰہی کے محرم اور رموز شریعت کے راز داں ہونے کی حیثیت سے فلسفہ کے ہر راز کو جاننے کے بعد اسلام کے راز کو اپنے رنگ میں کھول کر دکھایا، اور اسی حیثیت سے ان کا مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے، اگر کسی مغربی مفکر کی فکر کی آواز بازگشت اقبال کی شاعری میں سنائی دیتی ہے تو کیا اس کی تعبیر یہ نہیں ہے کہ خود مغربی مفکر نے اسلام کے مفکرین سے خوشہ چینی کی، فلسفہ میں قطعیت نام کی کوئی چیز نہیں، تو اسلام کے مفکرین کے یہاں کیا وہ فکر نہیں جو مغربی مفکرین کے یہاں ہے، البتہ اس کو پیش کرنے کا وہ موثر اور جاندار انداز اسلام کے مفکرین کے یہاں نہیں جو مغربی مفکرین کے یہاں ہے، اقبال نے اسلامی مفکرین کی چیزوں کو جب موثر اور جاندار طریقہ پر پیش کیا تو مغربی مفکروں کے خیالات سے مرعوب ہونے والوں کو ایسا معلوم ہوا کہ وہ مغربی مفکرین ہی کے رتھ کے مسافر ہیں، یہ تو بہت آسانی سے دکھا دیا گیا ہے کہ اقبال مغرب کے اِس اور اُس مفکر سے متاثر ہوئے، لیکن رومی، سنائی، عراقی اور ایک دو ایسے اور اسلامی مفکروں کے اثرات کے تجزیے کی تو ضرور کوشش کی گئی، لیکن ان حکماء، عُلماء اور صوفیہ کے اثرات کی باضابطہ کھوج لگانے کی

اب تک کوشش نہیں کی گئی ہے جن سے اقبال کیا بلکہ مغربی مفکرین بھی متاثر ہوئے، اگر اقبال کا مطالعہ اس حیثیت سے کیا گیا تو اقبال ہرگز مغربی مفکرین کے کاسہ لیس یا دریوزہ گر نظر نہیں آئیں گے۔

جناب بشیر احمد ڈار صاحب نے اپنے مذکورہ بالا مضمون میں اس کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ اقبال نے کلام پاک کی کن کن آیتوں اور ہدایتوں سے اپنی خودی کے فلسفہ کی تشکیل کی، ضرورت اس کی ہے کہ ان اجمالی اشاروں کو تفصیل سے بیان کیا جائے۔

ماہ نو کے زیر نظر نمبر میں آخر میں اقبال کی مختلف سرگرمیوں کی تصویریں بھی ہیں، اس کے آخری صفحہ پر عبد الرحمن چغتائی نے اقبال کی جو تصویر بنائی تھی، وہ دکھائی گئی ہے۔

ثقافت سہ ماہی کا اقبال نمبر: یہ اسلام آباد کے پاکستان نیشنل کونسل آف دی آرٹس کا ترجمان ہے، اس کی مجلس مشاورت میں پاکستان کے چوٹی کے اہل علم اور اہل قلم شریک ہیں، جن کے اسمائے گرامی یہ ہیں: ڈاکٹر محمد حسن دانی، پیر حسام الدین راشدی، ڈاکٹر این، اے، بلوچ، پروفیسر قدرت اللہ فاطمی اور عطا شاد ہیں، چیف ایڈیٹر اعجاز احمد سیرین ہیں، اس کی کتابت و طباعت ایسی اعلیٰ اور عمدہ ہے کہ اگر اردو کا ہر رسالہ اسی طرح شائع ہوتا رہے تو اردو زبان کے فروغ میں کوئی قدغن کارگر نہیں ہو سکتا ہے، اس کے مضامین کے عنوانات یہ ہیں، علامہ اقبال کا نظریہ دعا، انا، شعور اور خودی، اقبال اور عطیہ بیگم، اقبال اور عہد حاضر، اقبال اور تصور انقلاب، جاوید نامہ اقبال کا فلسفۂ تعلیم و تربیت، اقبال اور اسلامی ثقافت کی روح، اقبال کی شعری علامتیں، برصغیر میں جدید مسلم الٰہیات کی تشکیل میں اقبال کا حصہ، قومی کردار اور فکر اقبال کے تناظر میں اقبال کا ایک شعر، اقبال شخصیت و کردار، بلوچستان اور اقبال، یہ تمام مضامین بڑی خوش سلیقگی اور خوش مذاقی سے لکھے گئے ہیں، جن کو پڑھنے کے بعد ناظرین پر یہ اثرات مرتب ہوتے ہیں کہ اقبال کا خیال تھا کہ ہم دعا ہی سے مذہبی واردات کو اس کے قریبی یا مماثل واردات سے، خواہ وہ اخلاقی ہوں یا جمالیاتی،

میز کر سکتے ہیں، مذہب کی حقیقت صفر کے برابر رہ جاتی ہے اگر اس میں سے وہ پہلو نکال دیا جائے جس سے انسان اس حقیقت سے وابستہ ہو جاتا ہے جو اس کی زندگی کا منبع ہے، اس پہلو کو دعا کہا جاتا ہے، دعا سے روح کی وسعتیں بڑھ جاتی ہیں، اس لئے کہ محدود اور لامحدود میں تعاون یا ملاپ ہو جاتا ہے، اس لئے بیک وقت ایگو کی اثبات اور منفی ہو جاتی ہے، اقبال نے انا اور شعور کی بحث کو خودی کی اصطلاح سے ظاہر کر کے اس کا تعلق انسانوں کی روزمرہ کی زندگی اور اجتماعی سیاست، معیشت اور عملی سرگرمیوں سے وابستہ کر دیا جو اس سے پہلے کسی سے ممکن نہ ہوا تھا، اسی وجہ سے اقبال فلسفہ کی دنیا میں ایک خاص مقام حاصل کر گئے، اقبال زمانۂ حال کی جدید تہذیبی اور سیاسی موشگافیوں کی چھان پھٹک بھی ضروری سمجھتے ہیں، ان کے نزدیک زندگی بھی ایک وحدت، انسانیت بھی اور زمانہ بھی، نتیجہ یہ کہ قصۂ قدیم وجدید کم نظری کی دلیل ہے، عہد حاضر کی نجات اس میں ہے کہ انسانی تاریخ کے روشن ترین عہد یعنی زمانہ مصطفےٰؐ سے بصیرت افروز ہو کر ایک نئی معاشرت کی داغ بیل ڈالی جائے، اقبال کا تصور انقلاب اشتراکی تصور انقلاب سے ظاہری مماثلت رکھنے کے باوجود اپنی بنیاد میں اس سے مختلف ہے، مارکس کا تصور انقلاب مادی تاریخی اور عقلی بنیادوں پر استوار ہے، جب کہ اقبال اسے مذہب اسلام کے پس منظر میں رکھ کر دیکھتے ہیں اور اشتراکی انقلاب کو اسلامی انقلاب میں منقلب کرنے کے خواہشمند ہیں، ان کے اسلامی انقلاب کو مارکس کے معاشی انقلاب سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش ایک فکری مغالطہ کے سوا کچھ نہ ہوگی، اقبال نے اپنے انگریزی خطبے (تشکیل جدید) میں اسلامی مفکروں، تاریخ دانوں اور سائنس دانوں کے مفصل ذکر سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یورپ کی جدیدیت دراصل مسلمان سائنس دانوں اور مفکروں کی تحقیق کی مرہون منت ہے، اور مسلمان علماء یہ سب کچھ اس لئے کر پائے کہ وہ قبائلی عقیدوں کے پیروکار نہیں تھے، بلکہ ایک متحرک، تخلیقی اور رواں دواں دین کے

ماننے والے تھے، ایک ایسا دین جس نے مستقبل کی باگ ڈور عام انسانوں کے ہاتھ میں دے کر تحقیق اور مشاہدے کا حکم لگا دیا ہے، اقبال کے نزدیک اسلامی الٰہیات میں اس یونانی نظریے کو قبول کرنے کی کوئی جگہ نہیں ہے کہ کائنات ایک ساکن اور جامد وجود ہے، قرآن حکیم کے نزدیک کائنات ایک متحرک، تخلیقی اور ہر آن تغیر پذیر وجود ہے، اسی تصور پر مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی بنیاد ہے، کوئی مسلم معاشرہ تغیر و تبدل کے تصور کو نظر انداز نہیں کر سکتا، وہ جمود اور سکون کا دشمن ہے، اس کے نزدیک زندگی صرف تغیر اور انقلاب سے عبارت ہے، اقبال کا حسین معاشرہ ایک مثالی معاشرہ ہی نہیں بلکہ ایک ایسی دنیا بھی ہے جہاں بے انصافی اور عدم مساوات کا نام بھی نہیں، یہ معاشرت اپنے معنوں میں جمہوری تو ہے لیکن اس طرح کی جمہوری نہیں، جس کا تصور یورپ نے دیا ہے، وہ مغربی طرز جمہوریت کے اسی لئے مخالف تھے کہ ان کے نزدیک یہ طریقہ انصاف اور عدل پر مبنی نہیں، یہ ایک شاطرانہ نظام ہے جس میں چند سیاسی آقا اپنے مفادات کے لئے لوگوں کو ایک دوسرے کے خلاف اکساتے ہیں، اقبال کے نزدیک ان ساری خرابیوں کا علاج اسلام کے مثالی معاشرہ میں ہے، جہاں استحصال نام کی کوئی شے نہیں، لیکن اسلام کا مثالی معاشرہ نعرے سے وجود میں نہیں آتا، اس کے لئے ایک مسلسل عمل اور حسن کردار کی ضرورت ہے جو اقبال کی رائے میں صرف اسی صورت میں پیدا ہوتا ہے جب انسان عشق و سرمستی کی منزل کو چھو لیتا ہے۔

اقبال کی یہ وہ تعلیمات ہیں جن کو بہت ہی شرح و بسط کے ساتھ بیان کرنے کی ضرورت ہے، خوشی کی بات ہے کہ پاکستان کے اہل قلم اس کی طرف توجہ کر رہے ہیں، مگر اسی کے ساتھ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پاکستان کے مصنف اور اہل قلم اپنے اسٹوڈیو میں بیٹھ کر جو کچھ لکھتے ہیں، وہ کیا ان کی صرف ذہنی کرشمہ سازیاں اور قلمی جلوہ آرائیاں ہیں، یا پاکستان کا معاشرہ بھی اقبال کے تخیل کے

مطابق بن رہا ہے، یا رسائل و جرائد میں اقبال کو خراج عقیدت پیش کرنے کے بعد پاکستان کی ساری ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے؟ اس کا جواب پاکستان کے دانشوروں سے طلب کرنا ضروری ہے اگر وہ اس کا جواب تشفی بخش نہیں دے سکے تو اقبال کے یہ تمام خاص نمبر بہلانے والے کاغذی کھلونے ہی کی حیثیت رکھیں گے۔ پاکستان کے قیام میں ایک مبلغ اسلام نے بہت دکھ اور درد کے ساتھ خود مجھ سے کہا کہ وہ اسلام کی تبلیغ کے لئے کوریا، جاپان، یوگوسلاویہ اور دوسرے ممالک گئے اور وہاں کے کچھ لوگوں کو مسلمان کیا، مگر خود کراچی میں ان کی گردن شرم سے جھکی رہتی ہے کہ یہاں کی نوے فیصدی عورتوں اور اسی فی صدی مردوں نے نماز پڑھنا چھوڑ دیا ہے، ان کی یہ گفتگو سن کر خود مجھ کو دکھ ہوا کہ اقبال مسلمانوں کا ایک وطن بنا کر یہاں اسلام کی تشکیل جدید چاہتے تھے تاکہ یہ اسلام کا قلعہ بن جائے، مگر وہاں کا معاشرہ مثالی یا بقول علامہ محمد اقبال ملکوتی بننے اور عشق و سرمستی کی منزل کو چھونے کے بجائے یہ کہاں جا رہا ہے؟ اس کا فیصلہ خود اہل پاکستان کر سکتے ہیں، مگر اتنا ضرور لکھنے کو جی چاہتا ہے کہ پاکستان جاتے ہوئے ہم جب امرتسر پہونچتے ہیں تو وہاں کے لوگوں کو دیکھ کر معاً یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ ہم سکھوں کے شہر میں ہیں، مگر لاہور، اسلام آباد، اور کراچی پہونچ کر وہاں کے لوگوں کی وضع قطع اور ان کے رہن سہن اور طور طریقے کو دیکھ کر یہ خیال نہیں ہوتا کہ ہم اسلامی شہر میں گھوم رہے ہیں۔

پاکستان مصور کا اقبال نمبر، اس میں علامہ محمد اقبال پر فارسی میں مضامین ہیں، جن کے کچھ عنوانات یہ ہیں: اقبال و قائد اعظم پیش بین و واقع بین، از دکتر م۔ معز الدین اقبال بعنوان فیلسوف سیاسی مسلمانان شبہ قارہ از جی الانہ، مذہب و علوم از دیدگاہ اقبال، از دکتر محمد رضی الدین صدیقی، اقبال ایجاد کنندہ پاکستان، از سید عبدالواحد، نغمات آزادی آفرین علامہ اقبال از دکتر محمد ریاض، اقبال و رومی از دکتر خلیفہ عبدالحکیم، بحث در آثار

و سبک اشعار، علامہ اقبال از استاد دکتر حسین خطیبی، سیر اقبال شناسی در ایران، از سید مرتضٰے موسوی وغیرہ۔

ان مضامین میں استاد دکتر حسین خطیبی کا مضمون بحث در آثار و سبک اشعار علامہ اقبال، دلچسپی سے پڑھنے کے لائق ہے، استاد دکتر حسین خطیبی غالباً ایرانی ہیں، وہ رقمطراز ہیں کہ اقبال کی فارسی شاعری میں جہاں سبک ہندی ہے، وہاں سبک عراقی اور سبک خراسانی بھی ہیں، ان کا خیال ہے کہ اقبال جہاں رومی، سنائی، عطار کو مخاطب کر کے ان کے رنگ میں اشعار کہتے ہیں تو ان میں سبک خراسانی پیدا ہو جاتا ہے، ان کی مثنویوں، اسرار خودی، رموزِ بے خودی، جاوید نامہ، مسافر، پس چہ باید کرد، اے اقوام شرق میں، مثنوی مولوی کا سبک اور وزن ہے، پیام مشرق اور دوسرے قطعات میں بو علی سینا اور رومی کا رنگ ہے، گلشن راز جدید میں محمود شبستری کی تقلید کی گئی ہے، بعض اشعار میں بابا طاہر عریاں کی روش ہے، حافظ اور سعدی کے سبک میں جو غزل سرائی کی گئی ہے ان میں سبک عراقی زیادہ نمایاں ہے اگر یہ مضمون واقعی کسی اہل نظر ایرانی کا ہے اور کسی سیاسی مصلحت کے بغیر لکھا گیا ہے تو یہ اقبال کیلئے بڑا خراج عقیدت ہے، ورنہ ایرانی شعراء تو طالب آملی، کلیم، قدسی اور صائب کو بھی سبک ہندی کے نمائندے سمجھ کر ان کو زیادہ اہمیت دینے کے لئے تیار نہیں۔

اس زیر نظر اقبال نمبر میں بھی اقبال کی زندگی کے مختلف حصوں کی بہت سی تصویریں ہیں

پاکستان پکٹوریل کا اقبال نمبر: اس میں اقبال پر انگریزی میں مضامین کا انتخاب ہے جو اس انگریزی مجلہ کے گذشتہ شماروں میں شائع ہوتے رہے، ان میں اقبال کو اسلام کا فلسفی بتایا گیا ہے، ان کے نظریہ سیاست اسلامی پر بھی بحث کی گئی ہے، آرٹ اور لٹریچر پر ان کے خیالات کی وضاحت کی گئی ہے، تعلیمات پر ان کے افکار بھی بتائے گئے ہیں، پاکستان کی

تحریک میں ان کا نمایاں حصہ رہا ہے، اس کی تفصیل بھی ہے، انسان کو جس طرح انھوں نے بلند کرنے کی کوشش کی ہے وہ بھی دکھایا گیا ہے، اقبال کی شہرت یورپ میں کیسی ہے، اس پر بھی مضمون ہے، مذہب کے متعلق اقبال کے کیا خیالات تھے، شاعری اور غزل گوئی میں ان کا کیا درجہ ہے، ان پر بھی مضامین ہیں، اقبال اور دانتے، اقبال اور ملٹن پر بھی مقالات ہیں، میری نظر اقبال اور ملٹن کے مضمون پر زیادہ ٹھہری، خود مضمون نگار کو اعتراف ہے کہ اقبال نے اپنی کسی نظم میں ملٹن کا ذکر نہیں کیا ہے، اور یہ صحیح ہے، شیکسپیر پر ان کے کچھ اشعار ہیں، مگر کہیں ملٹن کے لئے تعریفی کلمات نہیں لکھے، محض اس لئے کہ ملٹن اور اقبال دونوں کی شاعری میں شیطان اور زوال آدم کا ذکر ہے اگر اس لئے اقبال پر ملٹن کے اثرات دکھانے کا جواز ہو جاتا ہے، تو یہ صحیح نہیں، توارد کا ہو جانا اثر پذیر ہونے کا ضروری ثبوت نہیں۔ غالب کے یہاں بھی توارد کی مثالیں ملتی ہیں، مگر ان کو اپنے ہی خیال خانۂ ازل پر فخر رہا، اور اسی فخر میں یہ کہہ گئے ہیں کہ شاعری کوئی چک یا تمسک تو نہیں جس پر کسی خاص آدمی کا دستخط یا مہر یا نام ہو، یہ ایک نوٹ ہے کہ جس کے ہاتھ میں آجائے اُسی کی ملکیت ہے، اقبال کی ملکیت کا اندازہ بھی اسی روشنی میں لگانا چاہئے۔

ہفت روزہ اسلامی جمہوریہ کا اقبال نمبر: یہ اقبال نمبر پاکستان کے مشہور صحافی مجیب الرحمن شامی کی ادارت میں شائع ہوا ہے، اس کی ضخامت زیادہ نہیں، مگر مختلف مضامین میں اقبال کی زندگی کے جزوی واقعات دلچسپ انداز میں لکھے گئے ہیں، مثلاً وہ بڑے نرم دل تھے، بات بات پر رو پڑتے تھے، خود کبھی مرغی ذبح نہیں کی اور نہ ذبح ہوتے دیکھی، انھوں نے کبھی کسی ملازم کو نہیں ڈانٹا، اپنے بڑے بھائی عطا محمد کے بہت زیادہ فرماں بردار تھے، ان کو کبوتروں سے بہت زیادہ محبت تھی، اپنے دوستوں کے ساتھ کبوتر اڑایا کرتے اور کہتے کہ کبوتروں کو نیلگوں فضا کی لامحدود وسعتوں میں اڑتا ہوا دیکھتا ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ

جیسے میں خود بھی ان کے ساتھ آسمان کی رفعتوں میں شریک پرواز ہوں، وہ بچپن میں منظوم قصے اپنی شیریں آواز میں عورتوں کو سنایا کرتے تھے، لندن میں غیر اسلامی طریقہ سے ذبح شدہ جانوروں کا گوشت استعمال کرنے سے پرہیز کرتے رہے، لندن میں نماز کا شغف زیادہ بڑھ گیا اور برابر کہتے کہ یورپ نے مجھے مسلمان کر دیا، یورپ سے تعلیم حاصل کر کے وطن واپس آئے تو وہی ہمیشہ کا تہبند بندھ گیا، وہی بنیان بدن پر رہ گیا، اور وہی کمبل شانوں پر سوار ہو گیا، ایک بار انھوں نے گورنمنٹ کالج میں آئن سٹائن کے نظریے پر ایک لکچر دیا تو مختلف مفکرین کے نظریات کی تشریح کرتے ہوئے کہا کہ سائنس اور تصوف کے درمیان فاصلہ کم ہو رہا ہے، صوفیاء کی واردات اور سائنس ایک وقت ایک دوسرے کے قریب آجائیں گے۔ مولانا محمد علی کہا کرتے کہ اقبال نے ہمیں مسلمان بنایا ہے، ایک بار وہ علامہ اقبال سے ملنے لاہور آئے، ملاقات کے بعد دونوں کو کہیں باہر جانا تھا، علامہ نے بوٹ منگوائے، تو مولانا محمد علی نے جھک کر ان کے تسمے باندھنے کی کوشش کی، علامہ نے پاؤں پیچھے ہٹاتے ہوئے ہنس کر کہا کہ تم اس قابل نہیں کہ میرے بوٹ کے تسمے باندھ سکو، وہ گول میز کانفرنس کے نمائندہ بن کر لندن جا رہے تھے تو دہلی اسٹیشن پر ان کا شاندار استقبال ہوا، اس وقت مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ میرے ساتھ نہ تو کوئی پرائیویٹ سکریٹری اور نہ سیاسی لٹریچر کا پلندہ ہے جس پر اپنے دلائل کی اساس قائم کروں، میرے ساتھ صرف حق و صداقت کی ایک جامع کتاب قرآن مجید ہے، جس کی روشنی میں مسلمانان ہند کے حقوق کی ترجمانی کرنے کی کوشش کروں گا، وہ یورپ کے سفر میں مسولینی سے بھی ملے، اس نے ان سے پوچھا کہ میری فاشسٹ تحریک کے متعلق ان کا کیا خیال ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ آپ نے ڈسپلن کے اصول کا بڑا حصہ اپنا لیا ہے جسے اسلام انسانی نظام حیات کے لئے بہت ضروری سمجھتا ہے، لیکن اگر آپ اسلام کے نظریہ حیات کو پوری طرح اپنا لیں تو سارا یورپ آپ کے

تابع ہو سکتا ہے، لیکن یہ ایک ایسی بات تھی جو مسولینی کو ذرا کم ہی سمجھ میں آسکتی تھی؛ مسولینی سے ملنے کے بعد اخبار نویسوں نے ان سے مسولینی کے بارے میں رائے پوچھی تو انھوں نے فرمایا کہ "آپ کا ڈوچے بغیر بائبل کا لوتھر ہے۔" ایک دفعہ کسی نے علامہ محمد اقبال کو لکھا کہ آپ نے مسولینی کے متعلق دو نظمیں لکھی ہیں لیکن دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کا جواب انھوں نے یہ دیا کہ اگر اس بندۂ خدا میں رحمانی اور شیطانی دونوں صفات موجود ہوں تو اس کا میرے پاس کیا علاج ہے۔

اسلامی جمہوریہ کے اقبال نمبر میں اس قسم کے بہت سے دلچسپ واقعات ہیں، جن کو پڑھ کر ناظرین کو غیر شعوری طور پر احساس ہوگا کہ اقبال کی شاعری کی طرح ان کی شخصیت میں بھی بڑی رعنائی اور دل آویزی تھی، اور جب یہ کہا جاتا ہے کہ وہ قرآن، حدیث، اسلام کے حکماء، صلحاء اور صوفیاء سے متاثر ہو کر اپنے خیالات پیش کرتے رہے تو اس کے یہ ہرگز معنی نہیں کہ وہ اسلام کے محض مبلغ بنے رہے، بلکہ ان کو فکر رہی کہ موجودہ مادیت میں انسانیت کی فلاح و بہبود اور انسان کامل کی نشو و نما کیسے ہو، ان کا عقیدہ تھا کہ انسان جمادی، نباتی اور حیوانی مدارج سے گذر کر انسانیت کے موجودہ مرتبے پر فائز ہوا ہے، مگر یہ اس کی آخری منزل نہیں، ابھی اسے آگے بڑھنا اور ملکوتی درجہ پر پہونچنا ہے، ان کے دل میں یہ بات جم گئی تھی کہ انسان اس ملکوتی درجہ پر اللہ تعالیٰ کے آخری پیام اسلام ہی کے ذریعہ سے پہونچ سکتا ہے، ان کے نزدیک اسلام میں احترام آدمی، مقام آدمی، عروج آدم اور یزداں صفات آدم کا جو تصور ہے وہ دنیا کے تمام نظریات کے مقابلہ میں بہتر اور بلند ہے، اسی لئے ان کے پہلو دار پیام کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے؛ زیر نظر اقبال نمبر میں یہ واقعہ بھی درج ہے کہ ۱۰ر جنوری ۱۹۲۹ء کو مہاراجہ میسور کی دعوت پر علامہ اقبال میسور گئے، جہاں میسور یونیورسٹی میں اس کے وائس چانسلر کی

زیر صدارت ایک لکچر دیا، اس موقع پر یونیورسٹی کے شعبۂ فلسفہ کے ایک غیر مسلم پروفیسر نے اپنی تقریر میں کہا: "ڈاکٹر اقبال کو مسلمان لاکھ اپنا کہیں، مگر وہ ہم سب کے ہیں، وہ کسی ایک مذہب یا جماعت کی ملکیت نہیں۔" اقبال کو اس حیثیت سے بھی سمجھ کر ان کے بلند مقام کو متعین کرنا ہے،

ماہنامہ محفل کا اقبال نمبر: اس کے مدیر علی طفیل ہوشیارپوری ہیں، ایک روز انٹرکانٹی نینٹل ہوٹل کی گیلری سے گذر رہا تھا تو ایک صاحب نے یہ نمبر پیش کیا، جس کو دیکھ کر یہ خیال ہوا کہ پنجاب کا ہر رسالہ اپنے شاعر مشرق کو خراج عقیدت پیش کرنے میں آگے آگے تھا اقبال کی محبوبیت اور مقبولیت اس موقع پر کچھ ایسی ہی بڑھی ہوئی تھی، اس نمبر میں حسب ذیل مضامین ہیں؛ اقبال کا نظریۂ فن، قرآن اور اقبال، اقبال کے نظام فکر میں سائنس کا مقام اقبال کے تعلیمی افکار، اقبال کا تصور خودی، اقبال اور فنون لطیفہ، اقبال بحیثیت آفاقی مفکر، اقبال اور ملت، اقبال کی چار نظمیں، اقبال کے تین شعر، کلام اقبال میں شہباز، شاہین اور عقاب کی لطیف رمزیت، علامہ اقبال مذہب سیاست اور معیشت، اقبال کی نظر میں عورت کی اہمیت، اقبال اپنے قصر احساس میں، اقبال اور نوجوان وغیرہ۔ پھر اقبال پر بہت سی نظمیں بھی ہیں، مذکورہ بالا عنوانات کچھ نئے نہیں، ان پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، لیکن پھر بھی بہت کچھ لکھنے کو باقی رہ گیا ہے، ان ہی عنوانات پر آیندہ اور بھی اہل قلم لکھ کر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کریں گے اور جتنا زیادہ لکھا جائے گا اتنا ہی اقبال کندن کی طرح چمکتے نظر آئیں گے۔

ہنر و مردم کا اقبال نمبر: یہ فارسی مجلہ ایران کی وزارت فرہنگ و ہنر کی طرف سے شائع ہوا ہے، اس کو ہاتھ میں لیتے وقت خیال ہوا کہ اس میں ایرانی دانشوروں کے مضامین ہونگے مگر ان کے بجائے زیادہ تر پاکستانیوں ہی نے اپنی عقیدت کا خراج پیش کیا ہے، اس سے گمان ہوا کہ شاید ایرانی اب تک اقبال کے مرتبہ کو صحیح معنوں میں پہچان نہیں سکے ہیں، اقبال پر ان کی

عقیدت مندانہ نظمیں رسمی یا سیاسی مصلحتوں کی بنا پر ہو سکتی ہیں، دکتر حسین خطیبی کا ایک مضمون سبک شعر اقبال پر ہے، اس موضوع پر ان کے خیالات کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں، دکتر ذبیح اللہ صفا کا ایک انٹرویو اقبال پر ہے، اقبال جناب ذبیح اللہ صفا کے صرف ایک انٹرویو کے مستحق نہ تھے جناب ذبیح اللہ صفا کا ان پر ایک مضمون ہونا چاہئے تھا، تب ہی ایران کی اقبال شناسی کا خیال ہوتا، اقبال پر وہاں کے مشہور شاعر بہار کے دو تین اشعار بھی ایران کی اقبال شناسی کا ثبوت نہیں

اقبال پر مجھی ڈاکٹر معز الدین ڈائرکٹر اقبال اکیڈمی لاہور کی عنایت سے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب کی "اقبال اور مسلک تصوف" اور جناب ابوسعید نور الدین صاحب کی "اسلامی تصوف اور اقبال" ملیں، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب کی کتاب پڑھ کر متاثر ہوا، ان کو ادیب، نقاد، ماہر لسانیات کی حیثیت سے تو جانتا تھا، مگر اس کتاب کو پڑھ کر ان کے صاحب دل ہونے کا بھی اثر ہوا، ان دونوں کے علاوہ اقبال کے جشن کے موقع پر 'پس چہ باید کرد' کا انگریزی ترجمہ از جناب بشیر احمد ڈار، 'علامہ اقبال کی فارسی اور ایقان اقبال' از پروفیسر محمد منور، 'کتابیات اقبال' از جناب رفیع الدین ہاشمی، 'ذکر اقبال' پیش کش جناب اصغر یعقوب، 'پاکستان کی نظریاتی بنیادیں' از ڈاکٹر وحید قریشی، 'تاریخ جمہوریت اور انڈونیشیا' از شاہد حسین رزاقی، 'حدیقۃ الاولیا' از مفتی غلام سرور لاہوری، 'انتخاب گنج شریف' از حضرت سید حاجی محمد نوشہ گنج بخش قادری، 'مسلمانان پنجاب کی تعلیم' از سید مصطفے علی بریلوی، 'باقیات عتیق' مرتبہ سید محمد حسین رضوی، 'تاریخ التعلیم' از جناب وارث سرہندی، 'جوئے کوثر' از ڈاکٹر انعام الحق کوثر، 'احوال و آثار سید شرافت نوشاہی'، 'احوال و آثار عبداللہ خویشگی' محمد اقبال مجددی، 'کلیات محمد حسن براہوئی' از ڈاکٹر انعام الحق کوثر، 'دو بیتی نامہ بابا طاہر با ترجمہ منظوم بہ اردو' ترجمہ و ترتیب حضور احمد سلیم 'یار غار' از جناب احسن الدین سہروردی، 'حصول پاکستان' از پروفیسر احمد سعید وغیرہ ان شاء اللہ ان کتابوں کا ذکر معارف کی آیندہ اشاعتوں میں آئے گا۔ (باقی)

چہار مقالہ کی تاریخی اہمیت

از

ڈاکٹر زہرہ عرشی صاحبہ رام پور

فارسی کی قدیم نثری کتابوں میں چہار مقالہ ادبی اور تاریخی دونوں ہی حیثیتوں سے اہم ترین کتاب ہے، یہ کتاب نظامی عروضی سمرقندی کی تصنیف ہے جو شاہانِ غور کے دربار سے منسلک تھا وہ بڑی جامع حیثیتوں کا مالک تھا اور بیک وقت شاعر، نثر نگار، ماہر علم نجوم، طبیب اور مصاحب تھا اس کی ان صلاحیتوں کا ثبوت اس کی تصنیف چہار مقالہ ہے، یہ کتاب اس نے چار موضوعات پر لکھی ہے اور ہر موضوع سے متعلق ایک مقالہ ترتیب دیا ہے، چونکہ وہ خود ان تمام علوم و فنون میں اچھی دستگاہ رکھتا تھا اس لئے اس کی تحریر مفید بھی ہے اور دلچسپ بھی۔

اس کتاب کا نام مجمع النوادر ہے، لیکن یہ چار مقالوں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے چہار مقالہ کے نام سے مشہور ہوئی، امین احمد رازی نے "تذکرہ ہفت اقلیم" میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ مجمع النوادر اور چہار مقالہ دونوں علیحدہ اور مختلف کتابیں ہیں، اور یک کا مصنف نظامی عروضی اور دوسری کا حاجی خلیفہ ہے، لیکن یقیناً صاحب ہفت اقلیم کو غلط فہمی ہوئی ہے، حمد اللہ مستوفی نے تاریخ گزیدہ میں نظامی عروضی کی تصنیف کا نام مجمع النوادر تحریر کیا ہے اور چہار مقالہ کا ذکر نہیں کیا ہے، حالانکہ چہار مقالہ اس کے پاس موجود تھی، اور اس نے رودکی اور امیر نصر سامانی کی جو حکایتیں لکھی ہیں وہ اس سے ماخوذ ہیں، اگر یہ دونوں کتابیں ایک نہ ہوتیں تو یکساں حکایتیں یکساں الفاظ میں کیسے مل سکتی تھیں۔

ثانیاً یہ کہ قاضی احمد غفاری نے نگارستان کے مقدمہ میں تقریباً تیس حکایتیں تاریخ و ادب اور مختلف شعراء کے ذکر میں مجمع النوادر سے اخذ کی ہیں، عبدالوہاب قزوینی کے الفاظ میں:

"ایں حکایات بعینہا کلمہ بہ کلمہ مسطور در چہار مقالہ است"۔

صاحب مجمع الفصحا رضا علی خاں نے بھی اس کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"مجمع النوادر نظامی عروضی مشہور بہ سمرقندی موسوم بہ چہار مقالہ"۔

اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ چہار مقالہ اور مجمع النوادر ایک ہی کتاب ہے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ کتاب بادشاہوں اور ان کے درباری ماحول سے متعلق ہے، لیکن اس کے باوجود اس کا بڑا حصہ ایسا ہے جس سے علوم و فنون کے شیدائی استفادہ کرتے چلے آئے ہیں اور استفادہ کرتے رہیں گے۔

نظامی عروضی کا مقصد بادشاہوں کو اور ان سے متعلق شعراء و ادباء، نجومیوں اور طبیبوں کو یہ بتانا تھا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ کیسے پیش آئیں، ممکن ہے آج اس کی اہمیت ہماری سمجھ میں نہ آئے لیکن دربارداری کے عہد میں اس کی بڑی اہمیت تھی، بادشاہوں کی نازک مزاجیاں اہل علم و فن کے لئے اکثر جان لیوا ثابت ہوتی تھیں۔ اور چونکہ اہل فن کے لئے گذر اوقات کے راستے بھی محدود تھے، اس لئے ان کے لئے بادشاہوں سے مفر بھی نہ تھا، خود بادشاہوں کے لئے بھی اہل فن ناگزیر تھے، بادشاہوں کے اکثر اوقات جنگ و جدال میں گذرتے تھے، اس لئے ان کے ذہن کے لئے یہ لوگ تسکین اور سامان مسرت بہم پہونچاتے تھے، نظامی کا مقصد یہ تھا کہ یہ دونوں طبقے ایک دوسرے کے لئے باعث زحمت نہ بنیں، بلکہ باعث رحمت ہوں۔

وہ ایک اچھا ادیب تھا، چہار مقالہ اس امر کی واضح شہادت ہے، یہ کتاب اس لحاظ سے بڑی اہم ہے کہ اس میں معاصرانہ واقعات و حوادث کے بارے میں خاصی تفصیلات ہیں، بہت سے

واقعات خود اس کے چشم دید ہیں اور بہت سے واقعات کے سنانے والے اس کے زمانہ تک زندہ تھے یا جو اس کے زمانہ کے لوگوں کے ذہن سے فراموش نہیں ہوئے تھے، اس طرح اس کتاب کی اہمیت ایک تاریخی دستاویز کی ہوگئی ہے، یہ چاروں مقالے اہم تاریخی واقعات پر مشتمل ہیں، مثلاً عمر خیام کے بارے میں نظامی عروضی نے بڑی اہم معلومات فراہم کی ہیں، خیام کی شہرت اور یورپ وغیرہ میں اسے روشناس کرانے میں نظامی کا بڑا ہاتھ رہا ہے، اس لئے کہ یہی وہ پہلی تصنیف ہے جس میں اس کے بارے میں مفصل معلومات درج ہیں، اسے خیام سے شرف ملاقات بھی حاصل ہوا تھا، اس لئے اس کے بیانات یقیناً مستند ہیں، اسی حکایت میں نظامی عروضی نے خیام کی پیش گوئی کا تذکرہ بھی کیا ہے: "گور من در موضعی باشد کہ ہر بہارے و باد شمالی بر من گل افشانی می کند"۔

محمود غزنوی اور فردوسی کے تعلقات کے سلسلہ میں چہار مقالہ کی حکایت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اس ضمن میں اس نے بڑی اہم معلومات فراہم کی ہیں، گو بعض مورخین کو اس سے اختلاف ہے مگر اس کی اہمیت سے صرف نظر ممکن نہیں ہے۔

اس میں بہت سے ایسے واقعات کی تفصیل ہے جن کا شاہد مصنف چہار مقالہ کے سوا کوئی اور نظر نہیں آتا، بہت سے واقعات اور ایسے شعراء و ادباء کے نام اس میں محفوظ ہیں جو زمانے کے انقلاب میں فنا ہو چکے ہیں، بہت سی ایسی کتابوں کے ناموں کا اس سے پتہ چلتا ہے جن کا صفحۂ ہستی پر اب کہیں وجود نہیں ہے، اس میں ایسے تاریخی واقعات بھی مذکور ہیں جن کا تذکرہ کسی اور کتاب میں نہیں ہے۔

مقالۂ دوم جو شعر و شاعری پر مشتمل ہے بہت سے سامانی، غزنوی، سلجوقی اور غوری خاندان کے شاعروں کے سلسلہ میں معلومات کا خزینہ ہے، خصوصیت سے رودکی، فرخی، عنصری، ازرقی اور سعد سلمان کے بارے میں بڑی تفصیلات ملتی ہیں۔

اس کے علاوہ چہار مقالہ میں سلاطین، امراء، وزراء اور معاصرین کے تذکرے ان کی داد و دہش اور مجلس عیش و نشاط کی تفصیلات بھی ملتی ہیں۔

اہل نجوم اور دبیروں کے سلسلہ میں بہت سے اہم اور مفید مسائل پر بحث کی گئی ہے، جو ان علوم سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بہت مفید ہیں۔

حکیم ابو علی سینا، ابو ریحان البیرونی اور زکریا رازی کے متعلق نظامی نے جو حکایات تحریر کی ہیں وہ لائق توجہ ہیں۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ بعض جگہ ہم عصر واقعات کے لکھنے میں اس سے غلطیاں ہوئی ہیں اور مشہور و معروف ناموں کے لکھنے میں سہو ہوا ہے، کہیں کہیں سنہ و سال کی تقدیم و تاخیر بھی کی ہے، اس طرح کی بہت سی لغزشیں مصنف نے کی ہیں جن میں کچھ حسب ذیل ہیں:

(۱) اس نے اسکافی کو نوح بن منصور بن نوح بن نصر بن احمد سامانی کا دبیر فرض کیا ہے حالانکہ وہ اس کے دادا نوح بن نصر کا دبیر تھا اور تقریباً اس کی پیدائش سے بیس سال پہلے فوت ہو چکا تھا۔

(۲) سامانیوں کے سردار ابو علی احمد بن محتاج چغانی کو نوح بن منصور سامانی کا ہم عصر قرار دیا ہے، جب کہ وہ تقریباً ۲۲ سال قبل وفات پا چکا تھا۔

(۳) حکایت اول میں نظامی عروضی نے بیان کیا ہے کہ نوح بن منصور سامانی کے حکم سے سبکتگین نے سلجوقیوں کے ساتھ الپتگین پر حملہ کیا، یہ واقعہ تاریخی حقیقت کے بالکل خلاف ہے، سبکتگین نے خود سلجوقیوں پر حملہ کیا تھا نہ کہ الپتگین پر، الپتگین اس واقعہ سے پیشتر فوت ہو چکا تھا۔

(۴) اسی حکایت میں ابو علی بن محتاج کو بخارا کے لشکر میں سبکتگین کا معاصر بتایا ہے جب کہ

وہ اس واقعہ سے ۳۹ سال قبل وفات پا چکا تھا۔

(۵) حسن بن سہل اور اس کے بھائی فضل بن سہل میں اشتباہ ہو گیا ہے، اسی وجہ سے اسے ذوالریاستین لکھا ہے، حالانکہ یہ لقب اس کا نہیں بلکہ اس کے بھائی فضل بن سہل کا تھا، اسی طرح مامون کی بیوی کو فضل بن سہل کی بیٹی سمجھا ہے، حالانکہ وہ حسن بن سہل کی بیٹی تھی۔

(۶) مقالۂ اول کی ساتویں حکایت میں سلطان مسعود سلجوقی کو سلطان سنجر لکھا ہے اور المسترشد باللہ کی جنگ کو سلطان سنجر کے ساتھ بیان کیا ہے، حالانکہ مورخین باتفاق رائے یہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ جنگ سلطان مسعود کے ساتھ ہوئی تھی، سلطان سنجر کے ساتھ نہیں۔

(۷) اسی مقالہ کی دسویں حکایت میں بغرا خاں کو سلطان محمود غزنوی کا معاصر بتایا ہے جبکہ وہ ایلک خاں کا معاصر تھا۔

(۸) ایک اور بڑی تاریخی غلطی جسے اس حیثیت سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ مصنف اس کا عینی شاہد ہے، امیر شہاب الدین قلمش الپ غازی کے سلسلہ کی ہے، امیر شہاب الدین اصل میں ایک نامعلوم شخصیت ہے، مگر مصنف نے چونکہ خود اس واقعہ میں موجود ہونے کا دعوی کیا ہے اس لئے اس کی کوئی تاویل نہیں کی جا سکتی، سوائے اس کے کہ اس مقام پر عبارت میں تحریف ہوئی ہے۔

(۹) مقالۂ سوم کی حکایت اول میں عرب کے مشہور و معروف فلسفی یعقوب بن اسحٰق الکندی (متوفی ۲۵۹ھ) کو یہودی قرار دیا ہے، حالانکہ وہ پشتینی مسلمان تھے اور ان کے دادا اشعب بن قیس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے، اور اس سے متعلق ایک غلط حکایت بیان کی ہے۔

(۱۰) اسی مقالہ کی چھٹی حکایت میں نظام الملک طوسی کے قتل کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ فرقہ باطنیہ کے ہاتھوں بغداد میں ہوا ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ رمضان ۴۸۵ھ میں خواجہ نظام الملک طوسی ملک شاہ سلجوقی کے ہمراہ اصفہان سے بغداد جا رہے تھے، راستے میں نہاوند کے مقام پر قیام کیا

اسی جگہ فرقہ باطنیہ کے فدائیوں میں سے کسی نے اسے شہید کر دیا۔

(۱۱) چوتھے مقالہ کی چوتھی حکایت میں طبیب اجل ابوبکر محمد زکریا رازی کو منصور بن نوح سامانی کا ہم عصر قرار دیا ہے، حالانکہ منصور بن نوح بن نصر سامانی کا زمانۂ حکومت ۳۴۹ھ سے ۳۶۵ھ تک ہے اور زکریا رازی کی وفات ۳۲۳ھ میں واقع ہوئی ہے، غالباً غلطی سے منصور بن اسحٰق کے بجائے منصور بن نوح سامانی کا نام لکھ دیا ہے۔

(۱۲) شیخ ابو علی سینا کو علاء الدولہ بن کاکویہ کا وزیر بتایا ہے، حالانکہ وہ شمس الدولہ بن فخر الدولہ دیلمی کے وزیر تھے، علاوہ بریں شیخ کی وزارت ہمدان کے بجائے 'ری' میں فرض کی ہے۔

یہ اور اس قسم کی کچھ اور غلطیاں نظامی نے ان مقالوں میں کی ہیں، لیکن اس کے باوجود اس کی اہمیت ناقابل انکار ہے۔

تاریخی اہمیت کے علاوہ قدر و منزلت میں اس کی ادبیت کو بڑا دخل ہے، اس میں نظامی نے اپنی ادیبانہ صلاحیتوں کا کامیاب ترین نمونہ پیش کیا ہے، اس کی عبارت بہت صاف اور دل کش ہے، وہ مختصر الفاظ میں کثیر معانی کو سمونے کا بڑا اچھا سلیقہ رکھتا تھا، عبدالوہاب قزوینی نے اس کی ان صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ازحیث سبک انشا آں کہ در ایجاز لفظ و اشباع معنی و سلاست کلام و انسجام تقلیلہ
و صنائع لفظیہ بادہ کہ شیوہ ناخوش غالب نویسندگاں ایران بخصوص متاخرین ایشاں بودہ
سرمشق انشار و نمونہ چیز نویسی ہر ایرانی ہمیشہ باید باشد"

اس لحاظ سے وہ فارسی نثر نگاروں میں اپنا ثانی نہیں رکھتا ہے، اس کی عبارت میں بے ساختگی و روانی اس کی طرز ادا میں دل فریبی و دل کشی اس کی بندشوں میں چستی اور اس کے فقروں میں ایسی پیوستگی ہے جس کی نظیر اور کہیں نہیں ملتی، انھیں چیزوں نے چہار مقالہ کو ایک لازوال

حسن بخشتا ہے، پروفیسر براؤن نے اس کے بارے میں لکھا ہے:

One of the most interesting and remarkable prose work in Persian and one which throws a far fuller light than any other book on the intimate life of Persian and Central Asian Courts in the Twentieth Century of our era.

فارسی ادب کے نقادوں نے اسے موجودہ دور تک کی کتابوں میں بہترین قرار دیا ہے، ملک الشعراء بہار، ڈاکٹر رضا زادہ شفق، ڈاکٹر معین اور پروفیسر براؤن سبھی نے اس کی تعریف کی ہے، اس کتاب کا ترجمہ یورپ کی زبانوں میں بھی ہو چکا ہے اور اس کا ایک بہت عمدہ اڈیشن ایران کے مشہور ادیب بلند پایہ محقق عبدالوہاب قزوینی نے شائع کیا ہے، جس میں انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ کتاب اپنے انداز نگارش کے لحاظ سے تاریخ بیہقی، تاریخ گزیدہ، تذکرۃ الاولیاء اور گلستان سعدی کے ہم پلہ ہے، ظاہر ہے ایسی کتاب کا مصنف تاریخ ادبیات ایران میں کتنا اونچا مقام رکھتا ہوگا۔

وفیات

یادِ خلیل

از

ضیاء الدین اصلاحی

مرزا غالب مرحوم نے عارف کی موت پر کہا تھا ؎

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف — کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی مرحوم کی خبرِ وفات سن کر بے ساختہ یہ شعر زبان پہ آگیا، ابھی شاید وہ پچاس کے ہوں، بھلا یہ مرنے کے دن تھے، لیکن تقدیر کے راز کون سمجھ سکتا ہے انّ اجل اللہ اذا جاء لا یؤخّر۔ وہ بہت ہونہار، لائق اور ذی استعداد تھے، اپنی صلاحیت سے انھوں نے اس کم سنی ہی میں اردو کے مشہور نقادوں، ممتاز ادیبوں اور اہم شاعروں کی صف میں اپنی جگہ بنالی تھی، ان کا نام ادبی حلقوں میں عزت سے لیا جاتا تھا اور ان کے خیالات کا وزن محسوس کیا جاتا تھا۔

وہ اعظم گڈھ کے مردم خیز خطہ سے تعلق رکھتے تھے، سرائے میر کے قریب ایک گاؤں سیدھا سلطان پور کے رہنے والے تھے، ان کے والد محترم مولانا محمد شفیع صاحب مرحوم بڑے نیک نفس اور مقدس بزرگ تھے، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کا قیام انھیں کی جد و جہد کا نتیجہ ہے، جس کے نظم و نسق کی ذمہ داری ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہی نے بعد میں علامہ شبلی مرحوم کے ایما سے قبول کرکے اس کو بڑی شہرت و ترقی دی تھی، مولانا محمد شفیع مرحوم کے پانچ صاحبزادوں میں خلیل صاحب سب سے چھوٹے مگر اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے سب میں

ممتاز تھے، انھوں نے شبلی نیشنل اسکول سے میٹرک پاس کرنے کے بعد علی گڈھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا، تعلیم مکمل کر چکے تو وہیں شعبۂ اردو میں لکچرر ہوگئے، بعد میں ترقی کرکے ریڈر ہوئے، وہ اپنے استادوں میں پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم کی عقیدت کا دم بھرتے تھے، وہ ان کے ادب و دانش کے بڑے مداح اور ان سے تلمذ اپنے لئے مایۂ فخر خیال کرتے تھے، رشید صاحب کی طرح ان کو بھی اردو اور علی گڈھ سے عشق تھا، سرسید نگر میں ایک خوبصورت اور کشادہ مکان تعمیر کرایا تو اس کا نام "اردو باغ" رکھا، علی گڈھ سے اس قدر مانوس ہوگئے تھے کہ وہاں سے بہت کم باہر نکلتے، اپنے وطن بھی کئی کئی برس کے بعد آتے اور چار چھ روز سے زیادہ قیام نہ کرتے۔

خلیل الرحمٰن اعظمی کا تعلق ایک علمی و دینی گھرانے سے تھا، ان کے والد بزرگوار متورع عالم تھے، چاروں بڑے بھائی بھی دینی تعلیم حاصل کرکے علم و دین کی خدمت میں مشغول رہے، افسوس ہے کہ اب مولانا حبیب الرحمٰن، ابرار احمد، پرواز اصلاحی کے سوا سب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں، خلیل صاحب کی نشو و نما اسی علمی و دینی ماحول میں ہوئی تھی، وہ علی گڈھ گئے تو ان کے خیالات میں ترقی پسندی آئی اور دین کی طرف میلان میں کمی ہوگئی، مگر الحمد للہ چند برس قبل ان میں پھر تبدیلی آئی، وہ صوم و صلوٰۃ کے پابند ہوگئے تھے اور دین و مذہب سے تعلق بڑھ گیا تھا، انھوں نے ایک مردِ مومن کی طرح خندہ پیشانی کے ساتھ موت کا خیر مقدم کیا، اپنی آخری کتاب "مضامینِ نو" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

"گذشتہ ایک سال سے موت و حیات کی جس کشمکش سے گذر رہا ہوں، اس نے زندگی کی بے ثباتی اور ناپائداری کے نقش کو اور گہرا کر دیا ہے، یوں تو میں اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوں، مگر اس کے بلاوے اور پکار پر لبیک کہنے کو اپنے لئے باعثِ برکت سمجھتا ہوں، اس "جہانِ گندم و جو" میں ہمیشہ کے لئے رہنے، یہاں بستی بسانے اور چھاؤنی چھانے کی تمنا نہ پہلے تھی

اور نہ اب ہے۔"

کتب بینی اور مطالعہ کا شوق بچپن سے تھا، رات رات بھر جاگ کر کتابیں پڑھتے تھے، اسی میں ان کی صحت خراب ہو گئی، جب شبلی اسکول میں زیر تعلیم تھے تو پابندی سے دارالمصنفین کے کتب خانہ میں آکر اخبار، رسالے اور کتابیں پڑھا کرتے تھے، اسی تعلق کی بنا پر اعظم گڈھ آتے تو دارالمصنفین بھی ضرور آتے اور مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم اور جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب سے دیر تک علی گڑھ، دارالمصنفین اور اردو وغیرہ کے مسائل پر باتیں کرتے، یہاں کے پرانے کارکن مولوی عبدالباری صاحب سے زیادہ مانوس تھے، ان کے پاس اسی طرح بیٹھتے جس طرح طالب علمی کے زمانہ میں بیٹھا کرتے، اپنی آخری کتاب "مضامین نو" انھیں کے نام معنون بھی کی ہے۔

ان کا حافظہ بہت اچھا تھا، جو کچھ پڑھتے سب ذہن نشین ہو جاتا، اردو ادبیات پر ان کی نظر بہت وسیع تھی، اردو کی ترقی پسند تحریک کا بڑی گہرائی اور دقتِ نظر سے مطالعہ کیا تھا۔

گفتگو دلچسپ اور معلومات افزا کرتے، یوں تو شعر و ادب کے سبھی شعبوں سے دلچسپی تھی مگر تنقید ان کا خاص موضوع تھا، وہ ادبی و تنقیدی مسائل میں اپنا خاص نقطۂ نظر رکھتے تھے، جس کو بہت مربوط اور مدلل انداز میں پیش کرتے تھے، چاہے کسی کو ان کے خیالات سے اتفاق نہ ہو مگر وہ ان کی قوتِ استدلال، جوشِ بیان، دلنشیں انداز، منطقیانہ ترتیب اور خود اعتمادی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا، ان کی گفتگو اور تحریر میں جانبداری اور مصلحت کو دخل نہ ہوتا، وہ خود ترقی پسند ادیب تھے، مگر اس ادب کی خوبیوں اور خامیوں دونوں پر ان کی نظر تھی، اس کے انتہا پسندوں کی طرح "عوامی ادب" کی دھن میں وہ

اردو زبان کی پرانی روایات کو نظر انداز نہ کرتے، بعض نامور ترقی پسند ادیبوں کی تحریروں پر بھی بے لاگ تنقید کرتے، اظہارِ رائے میں نہ کوئی رو رعایت کرتے اور نہ کسی کی خوشی یا ناخوشی کی پرواہ کرتے، مولانا شبلی مرحوم کی عظمت کے معترف تھے مگر ان کے بعض ادبی و تنقیدی خیالات کے ناقد تھے اور مولانا کے عقیدت مندوں کے سامنے بھی ان کے متعلق بے جھجک اظہارِ خیال کرتے، اپنے ایک مضمون میں مولانا کے تنقیدی مسلک کی وضاحت کرکے اس پر کچھ رد و کد کی ہے، مگر آخر میں یہ اعتراف بھی کیا ہے:

"شعرالعجم اس اعتبار سے قابلِ قدر ہے کہ اس نے اپنے دامن میں فارسی شاعری کے بہترین جواہر پاروں کو سمیٹ لیا ہے، شبلی نے ان کی تشریح و ترجمانی ایسے موثر انداز میں کی ہے کہ عجم کا حسنِ طبیعت ہم پر ایک لازوال نقش چھوڑ جاتا ہے، شبلی کی تنقیدی نگارشات نے کئی نسلوں کے مذاقِ سخن کی تربیت کی ہے، وہ موجودہ دور میں بھی کافی دور تک ہماری رہنمائی کر سکتے ہیں۔"

ایک مرتبہ کہنے لگے کہ مولانا شبلی نے میر انیس کی حمایت کے جوش میں ان کے کھاتے میں مرزا دبیر کے اچھے اشعار بھی ڈال دئے ہیں، جیسے:

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے ۔۔۔ رن ایک طرف چرخ کہن کانپ رہا ہے

میں نے کہا آپ خود جوشِ بیان میں خلافِ واقعہ بات کہہ رہے ہیں، مولانا شبلی نے بھی اس شعر کو مرزا صاحب ہی کا بتایا ہے، کہنے لگے نہیں! جب میں نے ان کو موازنۂ انیس و دبیر دکھایا، تب جاکر چپ ہوئے، مگر ان کے قلم میں میانہ روی اور تحریر میں اعتدال تھا، اس لئے اختلاف کے باوجود شائستگی اور متانت کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پاتا۔

خلیل الرحمن اعظمی کی زندگی سادہ تھی، وہ تکلف، بناوٹ، نمائش اور ظاہر داری کو پسند نہ کرتے تھے۔ جو ان کے دل میں ہوتا وہی زبان پر بھی، وہ اپنی کسی ادا سے رعونت یا اپنی عظمت کا

احساس نہ ہونے دیتے، اعظم گڈھ آتے تو اپنے ایک ایک ساتھی اور دوست کو تلاش کرکے اس سے نہایت بے تکلفی سے ملتے، اپنے بزرگوں اور استاذوں سے عقیدت و احترام کا برتاؤ کرتے اور تواضع و انکسار سے پیش آتے، ان کی جو حیثیت تھی اس کی بنا پر جہاں جاتے اونچے سے اونچے درجہ کے لوگ ان کا خیر مقدم کرنے کے لئے تیار رہتے، مگر وہ اپنے دوستوں کے ساتھ رہنا پسند کرتے، اعظم گڈھ آتے تو میجر علی حماد عباسی صدر شعبۂ انگریزی شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج کے یہاں ہمیشہ قیام کرتے، جو ان کے کلاس فیلو، بے تکلف رفیق اور گہرے دوست تھے، اس سال فروری میں راقم بمبئی گیا، تو معلوم ہوا کہ وہ بھی آئے ہیں، ان سے ملنے کے خیال سے ان کے بڑے بھائی جناب پرواز اصلاحی کے پاس گیا اور ان کی قیام گاہ کے بارہ میں دریافت کیا تو انھوں نے بتایا کہ اپنے اسکول کے ساتھی حاجی نیاز اعظمی کے یہاں مقیم تھے مگر اب چلے گئے ہیں۔

خلیل اعظمی نے کم عمر پائی، لیکن جو عمر پائی وہ اردو کی خدمت میں گذار دی، درس و تدریس ان کا اصلی مشغلہ تھا اور وہ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے اچھے اور کامیاب استاذ تھے، تصنیف و تالیف سے مدت العمر سروکار رکھا، ان کے قلم نے نظم و نثر دونوں میں گلکاری کی ہے، کلام کے دو مجموعے "کاغذی پیرہن" اور "نیا عہد نامہ" چھپے ہیں، ان سے شاعری میں ان کی جدت طبع اور منفرد انداز کا پتہ چلتا ہے، لیکن ادیب و نقاد کی حیثیت سے ان کی زیادہ شہرت ہوئی "مقدمۂ کلام آتش" ان کی طالب علمی کے زمانہ کی تحریر ہے، مگر اسی کی بدولت وہ اردو کے مشہور ادیبوں اور نقادوں میں شمار کئے جانے لگے، "نوائے ظفر" بھی اسی طرح کی کتاب ہے "فکر و فن" "زاویۂ نگاہ" اور "مضامین نو" ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعے ہیں، جدید نظموں کا ایک انتخاب "نئی نظم کا سفر" کے عنوان سے کیا تھا، ان کی زیادہ اہم کتاب "اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک" ہے، جو ترقی پسند ادب کی تاریخ پر پہلی باقاعدہ کتاب ہے، یہ دراصل ان کے ڈاکٹریٹ کا مقالہ ہے، اس کے تین حصوں میں ترقی پسند مصنفین کی تحریک کی تاریخ

ان کے خدمات ادب کا جائزہ اور ان کے خیالات پر تنقید و تبصرہ کیا گیا ہے، مصنف نے یہ کتاب محنت و جستجو اور سلیقہ سے لکھی ہے، اس کی ترتیب و پیرایۂ بیان بھی عمدہ ہے، اعتدال و غیر جانبداری کی وجہ سے اس کو سنجیدہ ارباب ذوق نے پسند کیا ہے، مقالہ کے نگراں اور ممتحن جناب مجنون گورکھپوری اور پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اپنی اپنی رپورٹ میں اس کی بہت تحسین کی تھی، جب یہ شائع ہوکر دارالمصنفین آئی تو سب سے پہلے مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے اس کو شوق اور دلچسپی سے پڑھا اور کئی نشستوں میں اس کی تعریف کرتے رہے اور مجھ سے فرمایا کہ میں خود اس پر ریویو کروں گا، ان کے تبصرے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"مصنف نے بڑی محنت اور تلاش و تحقیق سے یہ کتاب لکھی ہے، اس کے لئے ترقی پسند ادب کا پورا دفتر کھنگالا ہے اور بڑے اعتدال و توازن اور حسن مذاق سے اس کا تنقیدی جائزہ لیا ہے، اس سے اس کی پوری سرگذشت اور اس کا ہر رخ سامنے آجاتا ہے مصنف ایک مشاق اہل قلم اور دیدہ ور نقاد ہیں، یہ خصوصیت اس کتاب میں بھی نمایاں ہے اس سے اردو کے ادبی ذخیرے میں ایک اچھی کتاب کا اضافہ ہوا"

خلیل الرحمٰن اعظمی کے ابھی متعدد مضامین کتابی صورت میں چھپنے سے رہ گئے ہوں گے، انجمن ترقی اردو کو ان کا ایک مجموعہ شائع کرنا چاہئے، چند برس پہلے انھوں نے انجمن کے ہفتہ وار اخبار "ہماری زبان" میں "میرا صفحہ" کے عنوان سے ایک سلسلۂ مضامین شروع کیا تھا جسے اس وقت بہت پسند کیا گیا تھا، اس کا مجموعہ بھی شائع کرنے کی ضرورت ہے۔

ان کی اٹھان بہت شاندار تھی، آئندہ ان کو بڑی توقعات وابستہ تھیں مگر یہ خوش درخشید ولے شعلہ مستعجل بود بلڈ کینسر کے موذی مرض نے ایک سال سے موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا کر رکھا تھا، بالآخر یکم جون ۱۹۷۸ء کو پیام اجل آگیا، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین

ادبیات

غزل

از

جناب ڈاکٹر سلام سندیلوی صاحب ریڈر شعبۂ اردو، گورکھپور یونیورسٹی

جب غم میں مسرت کا ہلکا سا خیال آیا　　محسوس ہوا ایسا وہ زہرہ جمال آیا

قطروں میں عرق کے وہ ڈوبی ہوئی پیشانی　　تابندہ ستاروں میں، کاہیدہ ہلال آیا

سائل جو پشیماں ہے، اس میں ہے خطا اس کی　　کیوں دست طلب اٹھا کیوں لب پہ سوال آیا

تابندہ جبیں پر تم ڈالو نہ شکن کوئی　　آئینہ جہاں چٹکا، آئینے میں بال آیا

کیا میری وفاؤں میں کچھ تم نے کمی پائی　　کیوں آنکھوں میں اشک آئے کیوں دل میں ملال آیا

ہے فصل بہاراں کی آمد کا یہی مطلب　　طائر چلے گلشن کو، صیاد کا جال آیا

فطرت کو کبھی اس حد تک تسخیر کیا میں نے　　ہونٹوں پہ ہنسی آئی جب دل میں ملال آیا

ممکن ہے کہ گلشن کا ماحول بدل دیتا　　لیکن گل رنگیں پہ نا وقت زوال آیا

نایاب سلام اتنی، کیوں جنس محبت ہے
کیا شہر محبت میں، پھر قحط کا سال آیا

......٭٭٭......

غزل

از

جناب چندر پرکاش جوہر بجنوری

اڑاتا پھر رہا ہے خاک اک دیوانہ برسوں سے　　مرتب ہو رہا ہے عشق کا افسانہ برسوں سے

خدا معلوم کس کے منتظر ہیں میکدے والے　　بڑھائی جا رہی ہے رونق میخانہ برسوں سے

یہاں بھولے سے بھی لب پر نہ حرف آرزو آیا　　محبت ہے مگر افسانہ در افسانہ برسوں سے

نہ میں وحشی، نہ سرگشتہ، نہ میں بے خود نہ وارفتہ　　نہ جانے کیوں مجھے کہتے ہیں دیوانہ برسوں سے

خوشا نسبت کہ سوز عشق سے آتش بجاں ہوں میں　　سبق لیتی ہے مجھ سے فطرت پروانہ برسوں سے

خدا معلوم کس کی جستجو کس کی تمنا ہے　　بھٹکتا پھر رہا ہے جوہر دیوانہ برسوں سے

غزل

از جناب طفیل احمد مدنی

جب خود کو ترے غم میں مٹایا تو بنے ہیں　　ہم نے تجھے جی جان سے چاہا تو بنے ہیں

دل اہل محبت کے ہیں وہ ساغر نایاب　　قدرت نے جنھیں خود ہی بنایا تو بنے ہیں

اے ذوق سفر بڑھنے میں آئیں ہیں ہر اک　　ہر راہ میں کچھ نقش کف پا تو بنے ہیں

یاد رہے خود دار ہی کچھ کر کے دکھائیں　　دنیا کو دکھانے کو مسیحا تو بنے ہیں

اے کاش طفیل ابر کرم ٹوٹ کے برسے
ہم تشنگی و کرب کے صحرا تو بنے ہیں

———•———

مطبوعات جدیدہ

اعیان الحجاج حصہ دوم: مرتبہ مولانا حبیب الرحمن الاعظمی تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۳۱۴ قیمت تحریر نہیں، پتہ: مکتبہ اعظمی، مئو، اعظم گڈھ

حج اسلام کا بنیادی رکن اور ملت ابراہیمی کی عظیم الشان یادگار ہے، اس کی اہمیت کی وجہ سے اردو میں اس کے حقائق وفوائد اور آداب ومناسک پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن حجاج کے متعلق کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی گئی تھی، اس کمی کو پورا کرنے کے لئے شیخ الحدیث مولانا حبیب الرحمن الاعظمی نے اعیان الحجاج کے نام سے دو جلدوں میں یہ تذکرہ لکھا ہے، جو امت کے مشاہیر وکبار حجاج کے سوانح وواقعات پر مشتمل ہے، پہلی جلد ۵۵ء میں چھپی تھی اور اسی زمانہ میں اس پر معارف میں ریویو ہوا تھا، اس دوسری جلد میں پہلی اور دوسری صدی ہجری سے اس صدی کے نصف اول تک کے مختلف طبقوں کے ۳۶۸ افراد کا ذکر ہے، جن میں ارباب حکومت، صلحاء امت اور اصحاب علم وحکمت کے ساتھ ممتاز خواتین کا بھی ذکر ہے، ان کے علم وفضل اور صلاح وتقویٰ کے ساتھ ان کے موثر وسبق آموز اقوال بھی نقل کئے ہیں، اور واقعات حج ایسے دلآویز پیرائے میں لکھے ہیں جس سے حج وزیارت کا شوق پیدا ہوتا ہے اور حج کے دینی ودنیاوی فوائد وبرکات کا اندازہ ہوتا ہے، لیکن ناموں کی ترتیب سنین یا حروف تہجی کے مطابق نہیں دی گئی ہے، جس سے تلاش میں دشواری ہوتی ہے، بعض تذکرے حج یا اس سلسلہ کے کسی واقعہ کے ذکر سے خالی ہیں، جیسے امام حسن بصریؒ کے مکہ تشریف لے جانے کا ذکر تو ہے، مگر ان کے حج کے بارہ میں کچھ درج نہیں ہے ابو عبداللہ مغربی کے

پیادہ ستانوے (۹۷) حجوں کا ذکر ہے، لیکن کسی ایک حج کی بھی کوئی جزئی کیفیت نہیں بیان کی گئی ہے، واقعات وحالات کے انتخاب سے مولانا کے محدثانہ ومورخانہ ذوق کا پتہ چلتا ہے، مگر بعض واقعات ایسے نقل کئے گئے ہیں جو لوگوں کے لئے باعث تشویش ہوں گے، مثلاً ابو محمد جوینی کی شدت کا یہ عالم تھا کہ کبھی کبھی سال میں دوبار زکوٰۃ نکالتے تھے، یا ابو القاسم زنجانی طواف کے لئے آتے تو مطاف ان کے لئے خالی کردیا جاتا اور لوگ حجر اسود سے زیادہ ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے تھے، ان روایتوں کی تحقیق کی ضرورت تھی، ان معمولی فروگذاشتوں کے علاوہ کتاب قابل قدر اور لائق مطالعہ ہے۔
"ع۔ ص"

زبان اور قواعد: مرتبہ جناب رشید حسن خاں صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۵۰۴، قیمت ۱۷ روپیے شائع کردہ ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی۔

اردو کے مشہور اہل قلم جناب رشید حسن خاں کو املا، تلفظ اور لسانیات کے مسائل سے زیادہ دلچسپی ہے، ترقی اردو بورڈ نے اردو املا کے مسائل پر غور کرنے کے لئے جو سہ نفری کمیٹی مقرر کی تھی اس کے ایک رکن وہ بھی تھے، اردو املا پر ان کی ایک ضخیم کتاب پہلے شائع ہوچکی ہے، زیر نظر کتاب میں انھوں نے تلفظ اور اس سے متعلق مباحث پر اظہار خیال کیا ہے، یہ حسب ذیل نو (۹) مضامین پر مشتمل ہے (۱) صحت الفاظ (۲) مشترک الفاظ (۳) لغت اور استعمال عام (۴) ملائی۔ بالائی (۵) ترکیب ہند (۶) سقوط حروف علت (۷) اعلان نون (۸) مختارات امیر مینائی (۹) بحر البیان

پہلا مضمون زیادہ اہم اور طویل ہے، اس میں عربی وفارسی کے تقریباً ڈھائی سو ایسے الفاظ پر گفتگو کی گئی ہے جن کی حرکات اردو میں تبدیل ہوگئی ہیں، یا جو فارسی وعربی الفاظ کے قاعدے کے مطابق بے تکلف اردو میں بولے جاتے ہیں، لیکن فی الحقیقت وہ عربی وفارسی کے الفاظ نہیں ہیں، اس قسم کے الفاظ کے بارہ میں عام خیال یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ان کے استعمال میں عربی وفارسی حرکات وقواعد کی پابندی کی جائے، فاضل مصنف کے خیال میں یہ رائے صحیح نہیں ہے،

ان کے نزدیک یہ تبدیلیاں اردو کے مزاج اور ہندوستانی لہجے کے اقتضا سے خود بخود عمل میں آئی ہیں، اس لئے ان کو قبول کرنا ہی بہتر ہے، اس کے ثبوت میں انھوں نے پنڈت دتاتریہ کیفی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا سید سلیمان ندوی، بابائے اردو مولوی عبدالحق، مولانا حالی اور انشاء اللہ خاں انشاء کی تحریروں کے اقتباسات اور اساتذہ کے کلام سے شواہد پیش کئے ہیں، یہ سب الفاظ اس موضوع کی مشہور کتاب 'قاموس الاغلاط' سے منقول ہیں، مصنف نے ان کے بارے میں نور اللغات اور فرہنگ آصفیہ وغیرہ بعض دوسری کتابوں کے مندرجات بھی درج کردئے ہیں، تیسرا مضمون بھی اسی نوعیت کا ہے، ان دونوں کے ضمن میں لغت کی موجودہ کتابوں کی خامیوں کی نشاندہی کرکے ایک جدید لغت کو نئے انداز سے مرتب کرنے کی تجویز بھی پیش کی ہے، دوسرے مضمون میں ایسے چند لفظوں کا ذکر ہے جن کی تذکیر و تانیث کے متعلق اہل زبان مختلف الرائے ہیں، چوتھے مضمون میں اس کا ذکر ہے کہ ملائی کو اہل لکھنؤ نے کب سے بالائی کہنا شروع کیا اور اب ان میں فصیح کون ہے، مصنف دونوں کو فصیح سمجھتے ہیں، اس سلسلہ میں انھوں نے بالائی کو ترجیح دینے والے اہل لکھنؤ کی تردید کی ہے، پانچویں، چھٹے اور ساتویں مقالے بھی مصنف کی تلاش و محنت اور غور و فکر کا نتیجہ ہیں، "مختارات امیر مینائی" میں امیر کے مکاتیب کی مدد سے زبان و بیان کے دلچسپ نکات، الفاظ و محاورات، تلمیحات و متروکات، "تذکیر و تانیث اور قواعد عروض کے متعلق امیر کے خیالات واضح کئے گئے ہیں، مصنف کو ان کے جس خیال سے اختلاف ہوا ہے، حواشی میں اس کی تردید کی ہے، شروع میں ناسخ سے شروع ہوکر امیر و جلال پر ختم ہونے والے اردو شاعری کے دور کی خصوصیات بھی قلمبند کی گئی ہیں، آخری مضمون میں قواعد، لغت اور اردو مصادر کے متعلق امام بخش ناسخ کے بیٹے اور شاگرد امداد علی بحر لکھنوی کا ایک فارسی رسالہ نقل کیا گیا ہے،

لائق مصنف نے اس پر بھی مفید حواشی لکھے ہیں اور شروع میں بحر کے حالات و کمالات اور رسالہ کے اہم نکات و خصوصیات کا ذکر کیا ہے، یہ سب مضامین اہل علم و نظر کے مطالعہ میں آنے کے لائق ہیں، اصولی حیثیت سے تلفظ کے متعلق مصنف کی رائے سے اتفاق کے باوجود بعض الفاظ کے متعلق ان کے انکار و خیالات محل نظر ہیں، متعدد لفظوں کے بارہ میں شواہد پیش نہیں کئے گئے ہیں جیسے متوفی (بکسر فا) ص ۴۷، اعراف (بکسر اول) ص ۹۹، تمیز (بفتح اول) ص ۲۰۲، مصنف نے بعض لفظوں کے متعلق دو سفارشیں پیش کی ہیں، جیسے عصمت (بہ کسر و فتح اول) ص ۱۱۵، شتر (بفتح و ضم دوم) ص ۲۱۶، عندلیب ص ۲۱۶ غلاف، ص ۲۱۶، ندامت، ص ۲۲۰ (سب بہ کسر و فتح اول) ایسی صورت میں یکسانی کس طرح پیدا ہوگی اور انتشار سے کیسے بچا جائے گا، جس سے خود لائق مصنف نے بھی عموماً بے اطمینانی ظاہر کی ہے، اس رجحان کی پوری تائید نہیں کی جاسکتی کہ جو لفظ اصل کے خلاف بولے گئے، چاہے ان کا چلن نہ بھی ہوا ہو، انھیں اصل کے خلاف استعمال کرنے کی اجازت دے دی جائے، انھوں نے جلت کے بارے میں لکھا ہے کہ عربی میں بکسر اول ہے، لیکن اس کے معنی بھپا اور چرخی کے ہیں، جلدی کے معنی میں بفتح اول ہے، جو اردو میں بضم اول بولا جاتا ہے، نیز عجلہ بکسر اول تار مدورہ سے ہے جیسے مدرسہ و مکتبہ وغیرہ۔

صحبت یار آخر شد: ڈاکٹر شعیب اعظمی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر صفحات ۲۲۴ مجلد قیمت ۱۵؍ر پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اردو بازار، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۶

جولائی [illegible]ء میں ہندوستان کی بعض یونیورسٹیوں کے تیرہ [۱۳] اساتذہ و طلبہ کا ایک وفد بنیاد فرہنگِ ایران کی دعوت پر ایران گیا تھا، اس میں جامعہ ملیہ کے شعبۂ فارسی کے ریڈر ڈاکٹر شعیب اعظمی بھی تھے، زیر نظر کتاب اسی سفر کی سرگذشت ہے، اس وفد نے اصفہان، شیراز، خراسان اور تہران کی نظر غائر

سیاحت کی ہے مصنف نے مستقل عنوانات قائم کرکے وہاں کے قیام کی مفصل روداد تحریر کی ہے جس میں روزانہ معمولات ومشغل کے علاوہ لوگوں سے ملاقاتوں اور مشہور اور تاریخی مقامات کی سیاحت کے مفصل حالات بیان کئے ہیں، جس سے ایران کی تہذیب ومعاشرت اور طرز ماند وبود کا بھی خاصا اندازہ ہوجاتا ہے، لیکن ان کو اہل علم سے ملنے اور درسگاہوں اور یونیورسٹیوں کو دیکھنے اور کتب خانوں اور علمی اداروں کے شاہدے کا کم اتفاق ہوا، زیادہ تر گذرگاہوں اور بازاروں میں گشت رہا، اس لئے ان مقامات پر جس سطح کے لوگوں سے سابقہ ہوتا ہے زیادہ تر انھی کی زندگی کو قریب سے دیکھ سکے، جیسا کہ تہران کے زیر عنوان انھوں نے خود لکھا ہے "ہم خوش تھے کہ چلو ایک ایسے اجتماع میں شرکت کرنے کا موقع میسر آیا جو خالص ادبی تھا اور جس میں ایران کے ممتاز مورخین، محققین، مصنفین، شعراء، علماء اور فضلاء کو دیکھنے اور سننے کا موقع ملے گا، کیونکہ اب تک علم وادب کے میدان میں ہمارا معاملہ بالکل صفر تھا اور ہم صرف گھوم پھر، کھا پی اور سو جاگ کر ایران کی سیر کر رہے تھے" اس لئے دورحاضر کے ایرانی فضلا اور وہاں کے علمی ادبی اور تعلیمی سرگرمیاں اور سیاسی، تمدنی، مذہبی اور اخلاقی حالات کا اس میں کم ذکر ہے اور سڑکوں، شاہراہوں اور ہوٹلوں کے متعلق دلچسپ واقعات تفصیل سے درج ہیں، آئندہ ایران جانے والوں کو اس کتاب سے بہت فائدہ ہوگا، مصنف نے پیرایۂ بیان دلچسپ اور رنگین اختیار کیا ہے، اس لئے عام لوگ بھی اس کو شوق اور دلچسپی سے پڑھیں گے، کہیں کہیں زبان وبیان کی بعض غلطیاں نظر آئیں، جیسے صبح سویرے اٹھنے کا اس طرح ذکر کیا ہے "خواب عدم سے بیدار ہوئے" (ص ۸) ناپسندیدہ غذا کو بے رغبتی سے کھانے کے بارہ میں لکھا ہے "غرض ان سب (ماکولات) سے نبرد آزما تھے" (ص ۸۸) مندرجہ ذیل جملوں میں بھی خط کشیدہ الفاظ بے محل استعمال ہوئے ہیں: "اپنے دلچسپ سفرنامہ روشنائی نامہ سعادت نامہ اور زادالمسافرین دیوان کی میراث چھوڑ گیا" (ص ۳۶) شیراز اپنے جدید وقدیم کے دوراہے پر تھا (ص ۱۶۲) ہم سب بھوکے تھے، دن میں پھل اور شربت، چائے سے جی بہلا مگر جنس کے بغیر گذرا (ص ۹۸) جیسے کھانے کی ڈش، فریج میں رکھ کر دور وز تک استفادہ حاصل کرتے رہے (ص ۲۰۷) بھیڑ (ص ۵۱) اور بنیاد فرہنگ (ص ۵۹) جمع استعمال کئے گئے ہیں۔ "ض"

جلد ۱۲۳ ماہ شعبان المعظم ورمضان المبارک سنہ ۱۳۹۰ھ مطابق ماہ اگست سنہ ۱۹۷۰ء عدد ۲

مضامین

غالب مدح وقدح کی روشنی میں

حصہ اول

مؤلفہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، قیمت :- ۱۵ روپیہ "منیجر"